# رہنمایانِ اسلام



سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ ۲۰

# رہنمایانِ اسلام



سرکار سید العلماء الحاج مولانا
السید علی نقی النقوی دام ظلہ،

مطبوعہ
سرفراز قومی پریس، لکھنؤ

قیمت دو روپیہ

# تعارف

امامیہ مشن کے چودہ رسالے چہاردہ معصومین علیہم السلام کے حالات کے معقولیت عام حاصل کر چکے ہیں، چنانچہ ایک ایک رسالے کے کئی کئی ایڈیشن بھی شایع ہوئے ہیں۔ پھر بھی ضرورت محسوس ہوتی تھی کہ اس موضوع پر کوئی ایک مستقل کتاب بھی شایع کر دی جائے جسے کورس میں بھی داخل کرنے میں آسانی ہو چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر خود مصنف علام مدظلہ سے گزارش کی گئی اور ممدوح نے تمام رسالوں پر نظر ثانی فرماتے ہوئے انھیں ایک سلسلہ میں منسلک فرما کر ایک بسیط مقدمہ تمام معصومین علیہم السلام کے حالات سے متعلق تحریر فرما کر مرحمت فرمایا جسے شایع کیا جا رہا ہے

اُمید ہے کہ تمام معصومینؑ کے مختصر حالات کی ایک جامع کتاب کی افادیت کو مدنظر رکھتے ہوئے افراد ملت اس کا شایان شان خیر مقدم فرمائیں گے اور اس موقع کو قریب لائیں گے کہ ہر معصوم کے حالات پر بسیط کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو۔ والسلام

خادم ملت

سید ابن حسین نقوی عفی عنہ

آنریری سکریٹری امامیہ مشن، لکھنؤ

محرم ۱۳۸۲ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین وآلہ الطاہرین

# تمہید

رہنمایانِ اسلام کی سیرتِ زندگی کے مطالعہ کی ہمہ گیر اہمیت اور افادیت اسلام اور انسانیت کے نقطۂ نظر سے صحیح راستے کی تلاش، انسان کی فطرت میں داخل ہے، مگر ہزاروں برس گزرنے پر بھی یہ کاروان ایک متحدہ جادہ پر گام زن نہ ہوسکا، اُن کامل رہنماؤں کی صحیح معرفت نہ ہونے کی وجہ سے جن کے پیچھے چلنا ہی، اس کو اصل منزل تک پہونچانے کا ذمہ دار ہوسکتا تھا۔

ہدایت کی پیاس آدمی کو ہر چمکتے ہوئے بالو کے تختہ کی طرف دوڑاتی ہے، وہ پانی سمجھ کر لپک جاتا ہے، مگر بعد میں دھوکا ہوتا ہے۔

ضرورت ہے ایسے بے خطا انسانوں کے تعارف کی، جن کی ساری زندگی میں کتنی ہی گہری نگاہ سے چھان بین کی جائے، اُن کی بلندی کے تصور میں کوئی کمی نہیں، بلکہ ترقی ہی ہوتی چلی جائے، یہ "حقیقی رہنمایان اسلام" ہی ہیں، جن میں سے ہر ایک کی زندگی انسانی زندگی کی منزل معراج کا پتہ دیتی ہے۔

ایک "نظام تمدن" کی حیثیت سے، اسلام کو تاریخ عالم میں جو نمایاں جگہ حاصل ہے، اُس کو دیکھتے ہوئے "رہنمایان اسلام" کی سیرت زندگی میں صرف اس مذہب کے پیروؤں ہی کے لیئے ایک مقدس اور بابرکت ذکر سمجھ کر جاذبیت نہیں ہے، بلکہ تاریخ عالم میں تمدن و تہذیب کے ارتقاء کے نمایاں نشان ہونے کی بنا پر اُسے مشترک انسانی نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت حاصل ہے۔

اس کے باوجود یہ افسوسناک واقعہ ہے کہ آج کل ہمارے کالجوں اور اسکولوں کے مسلمان بچے بھی جتنا دوسرے حکماء و فلاسفہ کے حالات سے واقف ہیں، اتنا بلکہ شاید اس کا عشر عشیر بھی، اپنے رسولؐ اور اُن کے جانشینوں کے حالات زندگی سے واقف نہیں ہیں، یہ بہت بڑی کمی ہے جس کا دور ہونا وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

رسولؐ اور آل رسولؐ کی زندگیاں تمام نوع انسان کے لیئے ایک مکمل معیار کمال کی نشان دہی کرتی ہیں، اس بنا پر کہ انسانی

زندگی کو اپنے راستے میں طرح طرح کے نرم اور گرم حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور ہر طرح کے حالات میں اپنے فرض کا محسوس کرنا چاہیے وہ دلی خواہشوں اور طبیعت کے حوصلوں پر کتنا ہی بار ہو، یہی انسانیت کی روح اور اخلاق کی جان ہے اور اس کے لیے ایسے ہی رہناؤں کی سیرت زندگی کے مطالعہ کی ضرورت ہے، جنھیں اپنے نفس پر قابو حاصل تھا، اور جو ہر موقع پر جذبات سے نہیں، بلکہ فرائض کے احساس سے کام لیتے تھے، اور جنھوں نے دنیا کے سامنے ضبط، صبر، تحمل اور ایثار کے بہترین نمونے پیش کیے ہیں۔

محمدؐ و آل محمد علیہم الصلوٰۃ والسلام کی سیرت ایک جامع انسانیت اور اخلاق کی کتاب ہے، جس میں کہیں شجاعت کے مظاہرات ہیں، کہیں حلم کے، کہیں سخاوت کے کارنامے ہیں، کہیں ایثار کے۔ کہیں حکمت کے نمونے ہیں، کہیں علم و معرفت کے۔

چونکہ ان حضرات کو حالات زمانہ یکساں نہیں ملے تھے، بلکہ زمانہ کی کج رفتاری اور انقلابی چال سے ان کو مختلف حالات سے سابقہ پڑا اور ہر حالت کے اعتبار سے ان کو بہترین طرز عمل اختیار کرنا پڑا۔ اس لیے نوع انسانی کی بہتری کے لیے، ان میں سے ہر فرد کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ لازم ہے، کہ بغیر اس کے انسانیت کا کوئی ایک گوشہ تشنۂ ہدایت رہ جاتا ہے۔

ان میں سے پہلی ذات حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہے، جن کا اسوۂ حسنہ تمام مسلمانوں کے نزدیک واجب الاتباع ہے، اور آپ کی سیرت خلق عظیم کا کامل مصداق ہونے کی بنا پر تمام افراد بشر کے لیے بلند ترین معراج ارتقاء کی مثال ہے۔

اس کے بعد حضرت علی بن ابی طالبؑ کی شخصیت پر نظر ڈالیے تو آپ کی سیرت میں وہ ہمہ گیری ہے جو انسانوں کے کسی ایک گروہ، یا کسی ایک جگہ کے رہنے والوں کے لیے مثال نہیں ہے، بلکہ دنیا کا ہر آدمی آپ کی زندگی سے اپنے لیے نمونہ تلاش کر سکتا ہے۔ حالانکہ عام طور پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو وہ محدود نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر نوشیروان عادل کو ایک انصاف پرور بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا جا سکتا ہے، مگر وہ سلاطین ہی کے لیے نمونہ ہے۔ رعایا کو کس طرح مل جل کر صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہیے یہ سبق نوشیرواں کی سیرت سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ حاتم کا نام سخاوت میں مشہور ہے، مگر وقت آنے پر قوم و ملت کے لیے لڑائی کس طرح لڑی جا سکتی ہے، اُسے حاتم کی زندگی میں تلاش کرنا بے کار ہے، بڑے بڑے بہادروں کا نام دلاوری میں سامنے آتا ہے، مگر وقت پڑنے پر مظالم کس طرح سہے جا سکتے ہیں، ان کی زندگی اس کو نہیں بتا سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر ہر صنف کی مثال کے لیے

ایک ایک آدمی کا نام پیش کر دیا جائے مگر ان کا مجموعہ بھی یہ نہ بتا سکے گا کہ ان صفتوں کا ایک ساتھ اجتماع کیونکر ہو سکتا ہے، اور ان کا میل جول اس طریقہ پر کہ پورے طور سے ہر ایک کی مناسب حد اور موقع استعمال کو معلوم کیا جا سکے ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو ایک واحد ایسی شخصیت درکار ہے، جو اکیلی ان تمام انسانی اوصاف کا مجموعہ ہو، جس نے زندگی کی ہر منزل میں قدم رکھا ہو، اور ہر راستے میں اپنے قدم کے نشان چھوڑے ہوں۔ تاریخ عالم میں ایسی ہستی پیغمبر اسلامؐ کے حقیقی جانشین اور اُن کے تعلیمات کی مکمل تصویر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السّلام کی تھی، جن کی زندگی میں یہ تمام پہلو یک جا ہیں، اور دنیا آپ کی زندگی کے ہر رُخ پر نظر کر کے، ہر موقع پر اپنی رہنمائی کے پہلو تلاش کر سکتی ہے۔

تیسری اہم زندگی دختر رسولؐ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی ہے۔ آپ کی سیرت کو ایک خاص انفرادی اہمیت حاصل ہے، اس بنا پر کہ اسلامی تعلیمات، نوع انسانی کے صرف ایک طبقہ یعنی مردوں سے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ ان میں مردوں ہی کی طرح، عورتیں بھی داخل ہیں۔ طبقۂ خواتین کے لیے معیاری حیثیت سے جو ذات نمونۂ عمل بن کر پیش ہوئی، وہ حضرت سیدۂ عالم فاطمہ زہراؑ کی تھی، جن کی حیات طبقۂ خواتین کے لیے عملی و اخلاقی کمال کی منزل تک پہونچانے میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے، جتنی تیرہ معصومین کی زندگیاں مردوں کے لیے

اس کے بعد شہزادہ امن حضرت امام حسنؑ کی زندگی ہے، جنہوں نے امن وامان اور ملت اسلامیہ کی بہبودی کے لیے تاج وتخت کو ٹھکرا کر صلح پسندی کی مثال قائم کرنے کے ساتھ اپنے حکیمانہ شرائط صلح سے شریعت اسلام کے تحفظ کی اس ذمہ داری کو پورا کیا، جو اُن کے لیے ایک مقصد حیات کی حیثیت رکھتی تھی، اور اس صلح کے مرحلہ کو انجام دے کر اُس مجاہدۂ حق کے موقع کو قریب کیا جسے سالہ میں شہید کربلا حضرت امام حسینؑ نے انجام تک پہونچایا۔

جب کہ انسانی زندگی کو قدم قدم پر مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے ایک طرف اُسے اپنے بلند اخلاقی خصوصیات کو قائم رکھنے کے لیے خود اپنی نفسانی خواہشوں، حیوانی جذبوں اور جسمانی تقاضوں سے عقل کی رہنمائی اور فرض شناسی کے اصول کی پابندیوں کی خاطر جنگ کرنا پڑتی ہے، اور دوسری طرف سچائی کے راستے میں جو بیرونی رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں اُن کے مقابلہ کی ضرورت ہے، ماحول، رفتار زمانہ، ظلم اور تشدد کی طاقتیں اس کو اکثر راستے سے ہٹا دینے میں سیلاب کے بہاؤ، آندھیوں کے تیز جھکڑوں اور طوفان کے سخت تھپیڑوں سے دوچار کر دیتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر سختی کے ساتھ سچائی کے راستے پر قائم رہنا، جان پر کھیل جانا، اور اصول سے بال بھر نہ ہٹنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے۔ لفظی طور پر ثابت قدمی استقلال، ضبط اور صبر وتحمل کی لفظیں، اخلاق کی کتابوں اور حکمار کی

نصیحتوں میں بہت مل جائیں گی مگر مشکل منزلوں پر اور دشوار راستوں میں، انسان کا قدم آگے بڑھانے، حوصلوں کو قائم رکھنے اور ڈگمگاتے ہوئے پیروں میں استقلال پیدا کرنے کے لیے ایک عملی نمونہ کی ضرورت ہے، ایسے رہنما کی حاجت ہے جو ایسی سخت سے سخت منزلوں کو طے کیے ہوئے، اس آزمائش کی کڑیوں کو جھیلے ہوئے مشکلات کی گھاٹیوں اور راہ کی ناہمواریوں کو روندے ہوئے، کامیابی کی سب سے اونچی چوٹی پر کھڑا ہوا دنیا کو آواز دے رہا ہو کہ "آؤ اور میرے نقش قدم پر چل کر سچائی، حقانیت اور صبر و استقلال کی اُس معراج کو حاصل کرو" یہ نمایاں طور پر شہید کربلا حسین بن علیؑ کی ذات ہے۔

میرا ن میں زین العابدین حضرت علی بن الحسینؑ کی زندگی وہ ہے جس میں ایک طرف حقانیت کی راہ میں قید و بند برداشت کرنے کا نمونہ ہے، اور دوسری طرف عبادت کی بلند ترین مثالیں۔ اس دور میں جب کہ دنیا مادیت کی گرویدہ ہو رہی ہے، اور خدا کو بھولتی جاتی ہے، بلکہ بہت کچھ بھول چکی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر زبردست کمزور کو کچل دینا چاہتا ہے۔ ہر طاقتور بے طاقت کو مٹا دینا چاہتا ہے۔ ہر اکثریت اقلیت کو پامال کر دینا چاہتی ہے ضرورت ہے کہ اس وقت اللہ کے بندوں میں خالق کی بندگی اور سچی عبادت کا جذبہ پیدا کیا جائے، کیونکہ اگر اللہ کی بندگی پیش نظر

رہے تو خدمت خلق سے انسان غافل رہ نہیں سکتا۔ پھر طاقتور کمزور کو مٹائے گا نہیں، بلکہ اپنی قوت وطاقت سے اُس کا محافظ بن جائے گا اکثریت اقلیت کو فنا کرنا نہیں چاہے گی، بلکہ اس کے لیے سبب پناہ بنے گی۔ اس جذبۂ عبودیت کو پیدا کرنے کے لیے، اُن خالص بندگان خدا کا تذکرہ ہونا چاہیے، جنھوں نے سخت سے سخت موقعوں پر بھی اللہ کی یاد کو نہیں بھلایا۔ اطمینان اور سکون کے لمحوں میں رسمی طور پر عبادت سب ہی کر سکتے ہیں، اور خاطر جمعی کے عالم میں اللہ کو ماننے والے بہت سے اُس کا سجدہ کر لیتے ہیں، مگر مصیبتوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں، تکالیف و شدائد کے ہجوم میں، مظالم کے طوفانوں میں اور باپ بھائی اور دوسرے عزیزوں کی جدائی کے بے پناہ صدموں میں، ایسی عبادت کرنا کہ "زین العابدین" نام سے زیادہ مشہور لقب ہو جائے، اور ایسے سجدے کرنا کہ "سید الساجدین" خطاب ہو جائے، صرف حضرت علی بن الحسینؑ سے مخصوص ہے۔

ان میں سے حضرت امام محمد باقرؑ اور جعفر صادقؑ یہ دو ہستیاں وہ ہیں جنھوں نے علوم کے دریا بہا دیے، ان کے پہلے خدا پرستی کا وہ راستہ جسے حضرت محمد عربیؐ نے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، ظلم و ستم کی آندھیوں سے شبہات و اوہام کی گرد میں اٹ گیا تھا۔ اگرچہ آل رسولؐ میں سے ہر مقدس ہستی اس تعلیم کی حفاظت کرتی رہی اور اسی لیے قربانیاں پیش ہوتی رہیں، مگر سیاسی اقتدار کے شکنجوں نے زیادہ

انھیں کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع نہیں دیا۔ حضرت باقرؑ و صادقؑ ان دونوں بزرگواروں کو اُس وقت کے سیاسی حالات کی بنا پر اتنا موقع مل سکا کہ وہ رسولؐ کے گھرانے کے مقدس تعلیمات کو جو نوع انسانی کے سُدھارنے کے ذمہ دار ہیں، نمایاں اور صاف کر کے دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ نے حقانیت کی راہ میں قید کی کڑیاں جھیلیں اور مدت مدید تک سختیاں برداشت کیں، اور حضرت امام رضاؑ کو جنھیں سلطنت بنی عباس کے ولی عہد بننے پر مجبور کر دیا گیا تھا، یہ مثال پیش کرنے کا موقع ملا کہ اپنا کے دنیا کے اندر رہتے ہوئے، اور دنیاوی سلطنت کے ماحول اور دنیاوی سیاست کے اندر قدم رکھتے ہوئے؛ پھر کس طرح ہر ہر قدم پر اپنے خدا کی مرضی کو پیش نظر رکھا جاتا، اور اپنے دامن پر کسی قسم کی کوتاہی کا دھبا نہیں آنے دیا جاتا، اور ہر حال میں اپنے اس بلند فریضہ کو پورا کیا جاتا ہے، جس کے لیے انسان کو دنیا میں بھیجا گیا ہے

حضرت امام محمد تقیؑ کی عمر معصومینؑ میں سب سے مختصر ہوئی۔ آپ نے اپنی زندگی سے ثابت کر دیا کہ کوئی زندگی اگر نوع انسانی کے لیے صحیح نمونہ بن کر سامنے آئی ہو، تو چاہے وہ بہت کم وقت میں ختم ہو جائے، مگر اُس کے پائدار نقش جو انسانی دماغوں پر قائم ہو گئے ہیں، کبھی نہیں مٹتے اور باوجود اپنے مختصر ہونے کے نتیجہ کے لحاظ

سے، اور افادیت پر نظر کرتے ہوئے، تاریخ انسانی کا وہ اُتنا ہی اہم باب قرار پاتی ہے، جتنا زیادہ عمر کو حاصل کر کے کسی انسان کی زندگی ہو سکتی ہے۔

حضرت امام علی نقیؑ اور حسن عسکریؑ کی زندگیاں بھی انہی تمام خصوصیتوں کی حامل ہیں، جو جلا وطنی اور قید و بند میں گزریں، مگر علوم و احکام آل محمدؐ کی اشاعت کے کام کو جاری رکھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام "خیالی" عقائد کا مجموعہ نہیں تھا۔ وہ اس دنیا کے جیتے جاگتے انسانوں کے لیے اس حیات کی کشمکش میں، عمل کا صحیح راستہ دکھانے کے لیے آیا تھا۔ وہ راستا جو بال سے زیادہ باریک، اور تلوار کی دھار سے زیادہ تیز ہے۔ اس اعتبار سے کہ وہی طریق کار جو ایک حال میں درست ہے ایک دوسری مختلف صورت حال میں وہی نادرست ہو جاتا ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ زندگی کے ہر امکانی انقلاب میں صحیح عمل کے نمونے پیش ہو جائیں، کیونکہ انہی انقلابات میں انسانی کردار کے دوراہے آتے ہیں، اور ہر موڑ پر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ یہ راستا صحت کی طرف جا رہا ہو یا غلطی کی طرف یہ مقصد نہ صرف زبانی تعلیم سے پورا ہو سکتا تھا، اور نہ کسی ایک رہنما کی سیرت زندگی سے۔

اس مقصد کی تکمیل کے لیے قدرت نے "رہنمایانِ اسلام" کی

چودہ ہستیوں کو یکے بعد دیگرے پیدا کیا، جن کا مجموعی دور اس عالم میں چشم مشاہدہ کے سامنے تین سو برس کے قریب رہا۔ ان تین سو برس میں تیز و تند ہوائیں بھی چلیں، سخت سے سخت طوفان بھی آئے، اور انتہائی شدید زلزلے بھی۔ تمدن، سیاست، ماحول اور حالات نے طرح طرح کی کروٹیں بدلیں، رنگ رنگ کے تغیرات ہوئے۔ ان میں سے ہر منزل میں آل محمدؑ میں سے ایک معصوم ذات نے خلق خدا کے سامنے اپنا اسوۂ حسنہ پیش کیا، اور صحیح راستہ نگاہ کے سامنے نمایاں کر دیا۔

یاد رہے کہ تاریخ کی مختلف صدیاں، اپنے انقلابات میں تقریباً یکساں سے نمونے پیش کیا کرتی ہیں۔ وہی چند اوراق ہیں، جو شکلیں بدل بدل کر آنکھوں کے سامنے آتے ہیں، مگر روح حقیقت اُن کی یکساں ہوتی ہے۔

ذراسی دانائی و بینائی اور ذرا سے گوش و ہوش کی ضرورت ہے، پھر حالات اور اُن کے تقاضے کی یکسانی کا اندازہ کرنا، زیادہ دشوار نہیں ہے۔

آل محمدؑ نے ڈھائی سو برس کے اندر مختلف انقلابات میں اپنے عمل کے جو نقوش چھوڑ دیے ہیں، اُن کے بعد دنیا کا کوئی ماحول، کوئی انقلاب یا کوئی ہنگامہ ایسا نہیں ہے،

جس میں انسان اپنے فریضہ کی تعیین میں روشنی محسوس نہ کرے۔

شرط یہ ہے کہ اُن کی سیرت کے نقوش آنکھوں کے سامنے آتے رہیں۔

# حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

**نام و نسب** } حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کی اولاد میں ایک فرزند اسحٰقؑ کی اولاد سے بنی اسرائیل تھے جن میں حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ اور بہت سے دوسرے پیغمبر ہوئے اور دوسرے فرزند اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹوں میں قیدار کی اولاد حجاز میں آباد ہوئی تھی، جن میں عدنان سب سے زیادہ مشہور تھے۔ پیغمبر اسلام ان ہی کی اولاد میں سے تھے۔

آپ کا نسب نامہ عدنان تک اس طرح ہے:۔

محمد بن عبداللہ، بن عبدالمطلب، بن ہاشم، بن عبد مناف، بن قصی، بن کلاب، بن مرہ، بن کعب، بن لوی، بن غالب، بن فہر، بن مالک، بن نضر، بن کنانہ، بن خزیمہ، بن مدرکہ، بن الیاس، بن معز، بن نزار، بن معد، بن عدنان۔

ان میں سے نضر بن کنانہ کی اولاد قریش کہلاتی تھی حضرت کی والدہ آمنہ بنت وہب، بن عبد مناف، بن زہرہ، بن کلاب، بن مرہ تھیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ حضرت ماں اور باپ دونوں طرف سے قریش کے ممتاز قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔

**ولادت** } ۵۷۰ء میں جس سال ابرہہ حبشی نے خانۂ کعبہ پر ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ فوج کشی کی ہے جس سے عربوں نے عام الفیل کے نام سے سنہ مقرر کر لیا، اسی سال جمعہ کے دن ۱۷ ربیع الاول کو حجاز کی سرزمین مکہ پر حضرتؐ کی ولادت ہوئی۔

**یتیمی** } تاریخی حیثیت سے یہ مسلم ہے کہ حضرتؐ کے سر پر باپ کا سایہ دنیا میں باقی نہیں رہا، آپ کے والد جناب عبداللہ کا انتقال ہو گیا، اُسی وقت جب آپ ابھی ماں کے پیٹ میں تھے، یا پیدا ہونے کے بعد آپ دو مہینے یا سات مہینے کے تھے یا زیادہ سے زیادہ دو برس یا دو برس اور چار مہینے، یہ آخری مدت ہے، بہر حال مورخین میں اس کی تعیین میں اختلاف ہے جس میں کوئی قابل اطمینان فیصلہ دشوار ہے۔ صورت حال کی حسرت خیزی اور بڑھ جاتی ہے اس سے کہ چھ سال کی عمر جب ہوئی تو شفیق ماں کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ معلوم ہوتا ہے قدرت کی مرضی یہی تھی کہ تمام عالم کو اپنی محبت و شفقت کے سایہ میں جگہ دینے والا خود باپ اور ماں دونوں کے سایۂ عاطفت سے کم سنی ہی میں محروم ہو جائے۔

**تربیت** } قبیلۂ بنی سعد میں سے حلیمہ وہ خوش قسمت خاتون تھیں جو رسول اللہؐ کی رضاعت (دودھ پلانے) کے لیے مقرر ہوئیں اور اس دوران میں انھوں نے آپ کو اپنے گاؤں میں رکھا۔ اس کے بعد چھ برس کے سن تک آپ اپنی والدہ گرامی کے ساتھ رہے

جب ماں کا بھی سایہ سر سے اُٹھ گیا تو آپ کے دادا عبدالمطلبؑ نے آپ کو اپنے پاس بُلا لیا اور اپنی اولاد میں سب سے زیادہ محبت وشفقت کے ساتھ آپ کی پرورش شروع کی۔ مگر دو برس کے بعد جناب عبدالمطلب کی بھی وفات ہو گئی۔ اُنھیں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں فکر تھی تو اس بچہ کی حفاظت ونگہداری کی جس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ آگے چل کر دنیا کے سامنے اس کا بہت بڑا مرتبہ نمایاں ہوگا۔ اس لیے جب اپنی زندگی سے بالکل مایوسی ہو گئی تو انھوں نے اپنے فرزند ابوطالب کو بلا کر محمدؐ کو اُن کے سپرد کر دیا، دوسرے بھائی سن میں ان سے بڑے موجود تھے۔ مگر عبدالمطلب کی نگاہ دوربین دیکھ رہی تھی کہ محمدؐ کے لیے جس طرح ابوطالب جاں نثاری کے ساتھ خدمات انجام دیں گے اس طرح کوئی دوسرا انجام نہیں دے گا۔

چنانچہ ابوطالب نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک ہر طرح کے سخت سے سخت اوقات میں محمد مصطفےٰؐ کی نصرت وحمایت میں اُس عہد کو پورا کیا جو وہ اپنے بزرگ مرتبہ باپ عبدالمطلب سے ان کی اکھڑی ہوئی سانسوں کی آخری آمد ورفت کے عالم میں کر چکے تھے اور اس وقت سے کہ جب رسولؐ آٹھ برس کے تھے اپنی زندگی بھر رسولؐ کے ساتھ اُن کے چچا ابوطالب وہ محبت صرف کرتے رہے جو اپنی اولاد کے ساتھ صرف نہ کرتے تھے اور چچی فاطمہ بنت اسد وہ شفقت کرتی تھیں جس سے رسولؐ کو ماں کی محبت کا لطف حاصل ہو جاتا تھا، اس لیے آپ نے خود فاطمہ بنت اسد کے انتقال کے موقع پر یہ لفظیں فرمائیں کہ "یہ

میری ماں کے بعد میرے لیے ماں کا درجہ رکھتی تھیں۔"

**شام کا پہلا سفر** جب حضرتؐ کی عمر بارہ برس کی تھی تو ابو طالبؑ نے تجارت کے لیے شام کی جانب سفر کیا۔ اس سفر میں آپ بھی اپنے چچا کے ساتھ گئے اور اسی ذیل میں بحیرا راہب نے آپ کو دیکھ کر اُن آثار کی بنا پر جو گزشتہ آسمانی کتابوں میں مذکور تھے، کہا کہ یہ بچہ نبی ہونے والا ہے اور اسے بڑا اقتدار حاصل ہوگا۔ یہ ملاقات بحیرا سے اثنائے راہ میں صرف تھوڑی دیر کے لیے ہوئی تھی، کوئی غلط روایت بھی اس کا پتہ نہیں دیتی کہ آپ نے وہاں کچھ عرصہ تک قیام کیا ہو۔

**حلف الفضول میں شرکت** جب آپ کی عمر بیس سال کی تھی تو قریش میں حلف الفضول کا عہدنامہ ہوا کہ جو بے نظیر شریفانہ اصولوں پر مبنی تھا۔ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد قبائل عرب میں مطلق العنانی اور بے آئینی پیدا ہو گئی تھی، یہاں تک کہ پردیسیوں کے جان و مال مکہ میں محفوظ نہ رہے تھے۔ اس لیے بنی ہاشم کی دعوت پر زہرہ اور تیم کے قبیلے بھی متفق ہوئے اور سب نے عبداللہ بن جدعان کے مکان پر جمع ہو کے یہ عہد کیا کہ "ہم ہمیشہ مظلوم کا ساتھ دیں گے اور اُس وقت تک چین نہ لیں گے جب تک کہ اُس کی شکایت رفع نہ ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کی حق کوشی میں معاونت کریں گے۔" اس معاہدہ میں حضرت محمد مصطفٰیؐ نے بھی

شرکت فرمائی۔ یہاں تک کہ ظہور اسلام کے بعد جب عرب کے دوسرے زمانہ جاہلیت کے معاہدات کالعدم کر دیے گئے تھے، تو بھی آپ اس معاہدہ کا اپنے کو پابند سمجھتے ہوئے فرماتے تھے کہ آج بھی اگر کوئی مجھے اس معاہدہ کی بنا پر آواز دے تو میں اس کی آواز پر لبیک کہوں گا۔

**سفر تجارت** رسولؐ کی عمر پچیس سال کی تھی جب آپ خدیجہ بنت خُویلد کے اموال تجارت کو لے کر شام کی طرف گئے۔ یہ تجارت کی مہم اتنی کامیابی کے ساتھ انجام پائی کہ جتنا نفع ہر سال خدیجہ کو ہوا کرتا تھا اس سے دُونا نفع اس سال اُن کو حاصل ہوا۔

**شادی** تجارتی معاملات کے ذیل میں رسولؐ کے محاسن اخلاق، امانت و دیانت اور بلندی ذات و صفات کا جناب خدیجہ کے دل پر نہایت گہرا اثر پڑ چکا تھا اور خود جناب خدیجہ کے حُسن معاملت اور کردار کا رسول خداؐ کی نظر میں بھی وزن تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آپ کو جناب خدیجہؑ کے ساتھ شادی کے پیغام دینے کی طرف متوجہ کیا گیا تو آپ نے صرف یہ عذر فرمایا کہ خدیجہ کافی مالدار ہیں، میری اتنی مالی حیثیت نہیں ہے کہ میرے ساتھ وہ شادی پر تیار ہو سکیں لیکن درمیانی شخص نے جب اُن کے رضامند ہونے کی ذمہ داری لی تو آپ نے بخوشی پیغام دینا پسند فرمایا وہی ہوا کہ جناب خدیجہ نے اُسے فوراً منظور فرما لیا، چنانچہ تاریخ عقد

مقرر ہوئی جناب خدیجہ کی طرف سے اُن کے چچا عمرو بن اسد نے اور حضرتؐ کی جانب سے آپ کے چچا ابو طالب نے خطبۂ عقد اور ایجاب و قبول کے مراسم ادا کیے۔ باوجودیکہ جناب خدیجہ عمر میں حضرت سے کافی زیادہ تھیں مگر ان کے حسن سیرت کی آپ کی نظر میں اتنی عزت تھی کہ آپ نے ان کی زندگی میں کسی دوسری عورت سے عقد کا تصور بھی نہیں فرمایا۔

**سیرت کی بلندی** بچپن سے جوانی تک کی زندگی کے تجربات نے عربوں پر یہ اثر کیا کہ انھوں نے متفقہ طور پر آپ کی راست بازی اور امانت داری کو تسلیم کر لیا، اور آپ کو صادق اور امین کے القاب سے یاد کرنا اور اپنی امانتوں کو آپ کے پاس رکھوانا شروع کر دیا۔ اس کے علاوہ اہم معاملات میں آپ کے مشوروں کو قابل قبول سمجھنے لگے۔ چنانچہ خانۂ کعبہ کی مرمت کے موقع پر حجر اسود کے نصب کرنے کی عزت حاصل کرنے کی کوشش میں مختلف قبیلوں کے درمیان جو تنازع کی صورت ہو گئی تھی وہ آپ ہی کے حکیمانہ فیصلہ سے دور ہوئی اور سب نے اس کو بخوشی تسلیم کر لیا۔

**بعثت** حضرت کی عمر چالیس برس کی تھی جب آپ ۲۷ رجب کو تبلیغ رسالت کے فریضے پر مامور ہوئے۔ اور عملی طور پر خداوندی پیغام کے حامل قرار پائے، آپ نے بحیثیت رسول اپنے پیغام کو سب سے پہلے اپنی رفیقۂ حیات خدیجہ بنت خویلد تک پہنچایا، جس پر وہ سچے دل سے ایمان لائیں۔ اور آپ کے چچا زاد بھائی علی

ابن ابی طالبؑ جو برابر آپ کے ساتھ رہتے تھے، اور آپ کی رسالت کی عظمتوں کے پہلے سے عینی شاہد تھے۔ آپ کے دعوائے رسالت کے سب سے پہلے گواہ بنے۔ پھر رفتہ رفتہ دوسرے افراد تک بھی یہ آواز پہونچتی گئی اور اکا دکا لوگ آپ کے دعوے پر ایمان لاتے رہے، مگر ابھی تک تبلیغ رسالت رازداری کے ساتھ خاص خاص لوگوں کے سامنے کی جاتی تھی اور علی الاعلان اپنی آواز کو بلند کرنے کا موقع نہ آیا تھا۔ جو لوگ اسلام قبول کرتے تھے، انھیں بھی حکم یہی تھا کہ وہ مخفی طور پر اپنے مذہبی فرائض انجام دیں اور اس کی عام اشاعت نہ کریں۔

**دعوت عشیرہ** تین برس اس طرح رازداری کے ساتھ فرض تبلیغ ادا ہونے کے بعد دوسری منزل یہ تھی کہ اپنے قریبی عزیزوں کے مجمع میں اعلان کا حکم آیا۔ آپ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو، چنانچہ سامان دعوت کیا گیا اور اس میں تمام قریش کے ممتاز افراد کو مدعو کیا گیا سب جمع ہوئے۔ کھانے کے بعد حضرتؐ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں وہ چیز لے کر آیا ہوں، جو دنیا اور آخرت دونوں میں بہتری کی ضامن ہے۔ میں خلق خدا کو توحید اور اصلاح عمل کی طرف بلانے پر مامور ہوں۔ تم میں سے کون ہے جو اس مہم میں میرا ساتھ دے گا، تاکہ وہی میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہو۔ مجمع میں ایک سناٹا سا چھا گیا، کسی نے کچھ جواب نہ دیا، مگر بس ایک جوان بخت بچہ تھا جو اٹھ کھڑا ہوا، اور کہا میں آپ کا اس مہم میں

دست و بازو ہوں گا، یہ علی بن ابی طالبؑ تھے جو عملی طور پر پہلے ہی سے رسولؐ کے بازو بنے ہوئے تھے اور اب اس طرح وہ تمام مجمع کے سامنے بھی عہد وفا داری کر رہے تھے۔ پیغمبرؐ نے علیؑ کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، اور کہا کہ بس یہ میرا رفیق، میرا وصی اور میرا خلیفہ ہے۔

**مصائب شدائد** رسولؐ نے قریش کے سامنے علانیہ بُت پرستی کی مذمت اور خدا پرستی کی تبلیغ شروع کر دی۔ قریش آپ کی ایذا رسانی پر آمادہ ہوئے مگر ابو طالب کی شخصیت سے جو آپ کی محافظ تھی وہ مجبور ہو رہے تھے، آخر ان میں کے جو ممتاز افراد تھے وہ مل کر ابو طالبؑ کے پاس آئے اور بہت تلخ الفاظ میں رسولؐ کی شکایت کی اور کہا کہ یا تو اپنے بھتیجے کو روکیے یا آپ درمیان سے ہٹ جائیے ہم اُن سے سمجھ لیں گے، ابو طالبؑ نے حضرتؐ سے اس کا تذکرہ کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ میرے ایک ہاتھ پہ سورج اور دوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دیں تب بھی میں کلمۂ حق سے خاموش نہیں ہو سکتا، ابو طالبؑ نے ان لوگوں کو صاف جواب دے دیا جس سے ان کی عداوت کا شعلہ اور زیادہ بھڑک گیا اور خصوصیت کے ساتھ ان غریب مسلمانوں کو بہت تکلیف پہونچانے لگے جنھوں نے رسالت پیغمبرؐ پر ایمان قبول کیا تھا۔

**ہجرت اولیٰ** بعثت کے پانچویں سال مسلمانوں پر مظالم بہت ہونے لگے تو آپ نے اپنے اصحاب کو ملک حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی، چنانچہ کافی تعداد میں مسلمان حبشہ کی

طرف روانہ ہوئے، ان مہاجرین کے سرگروہ جعفر بن ابی طالب تھے جنھوں نے بہترین طریقہ پر عیسائی بادشاہ کے دربار میں اسلامی تعلیمات کی ترجمانی اور تبلیغ کا بھی فرض انجام دیا۔ جس سے بادشاہ اور ارکان سلطنت کے دل پر اسلامی عظمت کا سکہ جم گیا اور مسلمانوں کو وہاں اطمینان و سکون کے ساتھ قیام کا موقع ملا۔

**محاصرہ** حبشہ میں مسلمانوں کی کامیابی کے حالات کو سن کر مشرکین کے بغض و حسد میں اور ترقی ہوئی اور انھوں نے آپس میں متفق ہو کر یہ طے کیا کہ بنی ہاشم کا پورے طور پر بائیکاٹ کیا جائے، نہ صرف یہ کہ ان کے ساتھ شادی بیاہ جائز نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے ساتھ خرید و فروخت بھی نہ کی جائے، یہاں تک کہ ضروریات زندگی پانی اور کھانا تک پہونچنے نہ دیا جائے۔ ناچار ابو طالبؑ نے رسولؐ کو اپنے ایک محفوظ مکان میں جو پہاڑ کی گھاٹی میں ایک قلعہ کی صورت پر تھا منتقل کر دیا۔ یہ واقعہ رسالت کے ساتویں سال کا ہے اور تین برس مسلسل یہ محاصرہ قائم رہا۔ اس دوران میں حضرت رسول خداؐ اور آپ کے ساتھ تمام بنی ہاشم کو سخت تکالیف و شدائد کا مقابلہ کرنا پڑا یہاں تک کہ کئی کئی وقت ایسے گزر جاتے تھے کہ آب و طعام میسّر نہ آتا تھا، تین برس کے بعد یہ بائیکاٹ ختم ہوا اور یہ لوگ قلعہ سے باہر نکل سکے۔

**دو بڑے صدمے** افسوس ہے کہ اس محاصرہ کے ختم ہونے سے دو ہی مہینے کے بعد بعثت کے دسویں سال

ابو طالبؑ کا اور اُن کے صرف پینتیس دن بعد خدیجہ بنت خویلد کی وفات ہو گئی۔ ان دونوں آدمیوں کی رحلت کا رسول اللہؐ کو شدید صدمہ پہونچا اسی سے آپ اس سنہ کو "عام الحزن" (رنج کا سال) فرمایا کرتے تھے۔

**طائف کا سفر** ابو طالبؑ کے بعد قریش کی ایذا رسانی بہت بڑھ گئی وطن کی زمین رسولؐ کے لیے خارزار بن گئی۔ آپ کو اسلام کی اشاعت کے لیے اب کسی مناسب مقام کی تلاش بھی تھی، چنانچہ آپ نے بعثت کے دسویں برس کے آخر میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک داعی حق کی حیثیت سے طائف کا سفر کیا۔ بالکل بے زاد و بے توشہ صرف زید بن حارثہ کو ساتھ لیے ہوئے آپ نے عرب کے اس سرسبز مقام پر دس دن قیام کیا اور فرداً فرداً اسلام کا پیغام ہر ایک تک پہونچایا مگر افسوس کہ ہدایت کی کھیتی کے لیے یہ شاداب زمین بھی اوسر ثابت ہوئی نہ صرف یہ کہ ان لوگوں نے آپ کی آواز پر لبیک نہیں کہی بلکہ اپنے یہاں ٹھہرنے بھی نہیں دیا اور جسم مبارک پر پتھر مارنا شروع کیے آپ پھر مکہ معظمہ واپس آئے مگر یہ تمام مشکلات آپ کے قدم کو راہ حق میں مسلسل کوشش سے باز نہ رکھ سکے۔

**انصار کی ملاقات** مکہ معظمہ میں ہر سال مجنہ اور عکاظ کے جو بازار لگتے تھے اور ان میں مختلف اطراف و جوانب کے قبائل جمع ہوتے تھے، اس موقع پر شعرائے عرب اپنے قصیدے سُناتے تھے، تجار اپنے اموال تجارت لاکر فروخت کرتے تھے اور رسولؐ کا کام

یہ تھا کہ آپ قبائل عرب کے سامنے اپنے پیغام توحید کو پیش کر کے ان کو اپنی حمایت و نصرت کی دعوت دیتے تھے مگر دعوت حق کی آواز اُن ہی دلوں پر اثر کیا کرتی ہے جن میں کسی حد تک صلاحیت و قبول کی روشنی موجود ہوتی ہے۔

جب کہ اکثر قبائل بجائے وعدۂ نصرت کے حضرتؐ کی باتوں کا مذاق اُڑاتے تھے اور ایذا رسانی پر آمادہ ہوتے تھے۔ یثرب کی سرزمین کی ایک جماعت خوش قسمتی سے اس صدا سے متاثر ہوگئی۔ اور انھوں نے عقیدۂ حق کو قبول کر کے آپ کی امداد و نصرت کا وعدہ کرلیا۔ یہ تھا انصار کا پہلا گروہ جو شرف اسلام سے مشرف ہوا اور پھر انھوں نے اپنے شہر جا کر رسولؐ کا پیغام پہونچایا، اور بہت سے افراد نے غائبانہ آپ پر ایمان اختیار کیا۔ دوسرے سال ان میں کے بارہ آدمی رسولؐ سے آکر ملے اور آپ سے عقائد اسلامیہ کی تعلیم حاصل کی اور تیسرے سال ستر آدمیوں نے حاضر ہو کر اس سعادت کو حاصل کیا۔ اب مدینہ میں اسلام کافی طور پر پھیل گیا اور لوگ جوق درجوق مسلمان ہونے لگے جن میں سے اکثر صرف تعلیمات اسلامی سے متاثر ہو کر اس سعادت کو حاصل کر رہے تھے اور ابھی ان کو آنکھوں سے رسولؐ کے چہرۂ مبارک کی زیارت نصیب نہ ہوئی تھی۔

**مدینہ کی طرف ہجرت** } یثرب میں اسلام کی کامیابی کی خبریں سُن سُن کر اہل مکہ کا غیظ و غضب بڑھتا جاتا تھا اور

وہ اب مسلمانوں کو اور زیادہ ناقابل برداشت تکلیفیں پہونچانے لگے۔ آخر رسول خداؐ نے اُن کو یثرب کی جانب ہجرت کی اجازت دی اور رفتہ رفتہ اکثر مسلمان مکہ سے نکل گئے، صرف رسول خداؐ، علی مرتضےٰؑ اور چند دوسرے مسلمان باقی رہ گئے اب مشرکین کو یقین ہوگیا کہ رسالتمآبؐ کے لیے یثرب میں ایک محفوظ جائے پناہ حاصل ہوگئی ہے اب عنقریب یہ خود بھی وہاں پہونچ جائیں گے تو ہمارے مقابلہ میں ان کو بڑی طاقت حاصل ہو جائے گی، اس لیے دارالندوہ میں جمع ہوکر آپس میں مشورہ کیا اور یہ طے پایا کہ رات کے وقت آپ کے گھر کو گھیر کر آپ کے چراغ زندگی کو خاموش کر دیا جائے۔

حضرت رسولؐ کو اس کی اطلاع پہونچ گئی اور آپ نے طے فرمایا کہ آپ اپنے بستر پر علی بن ابی طالب علیہ السّلام کو لٹا کر خود مخفی طریقہ سے زمین مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کی طرف روانہ ہو جائیں، چنانچہ حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنے کو خطرے میں ڈال کر رسولؐ کے بستر پر آرام کیا اور حضرتؐ دشمنوں کی نگاہوں سے مخفی رہ کر مدینہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ اس اہم واقعہ کو ہجرت کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں میں ہجری تاریخ کی ابتدا ہوی ہے جسے اس وقت تک تیرہ سو اسی برس ہوے ہیں۔

**مسجد نبویؐ کی تعمیر** سب سے پہلا کام جو رسولؐ نے مدینہ پہونچ کر کیا وہ مسجد نبوی کی تعمیر تھی جس میں تمام مسلمانوں کے ساتھ خود رسولؐ بھی پتھر اُٹھا اُٹھا کر لانے میں شریک تھے۔ شروع

شروع بس ایک قد آدم اونچی چار دیواری پر اکتفا کی گئی۔ پھر جب نمازیوں کو گرمی سے تکلیف ہوئی تو شاخہائے درخت کا ایک سائبان ڈلوادیا۔ لیکن چھت باوجود اصحاب کے اصرار کے بنوانا پسند نہیں فرمائی۔

اس مسجد کے گرد چھوٹے چھوٹے مکانات اپنے اعزا اور ضرورت مند اصحاب کے لیے بنوائے جن کے دروازے پہلے مسجد ہی میں کھلتے تھے، مگر بعد کو سوائے حضرت علی بن ابی طالبؑ کے اور سب کے دروازے مسجد کی طرف کے بند کر دیے گئے اور آمد و رفت باہر سے قرار دی گئی۔

**جہاد** جب قریش کو معلوم ہوا کہ رسولؐ بخیر و خوبی مدینہ پہونچ گئے اور ان کا مذہب دن دونی ترقی کر رہا ہے، تو ان کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو گئی اور وہ مدینہ کے یہودیوں کے ساتھ مل کر کوششیں کرنے لگے کہ اس بڑھتی ہوئی طاقت کو کچل دیں، اس کے نتیجہ میں حضرتؐ کو مشرکین قریش اور یہودیوں کے ساتھ بہت سی لڑائیاں لڑنی پڑیں، جن میں سے اہم موقعوں پر حضرت خود فوج اسلام کے ساتھ تشریف لے گئے۔ ایسی مہموں کو "غزوہ" کہتے ہیں، اور جن موقعوں پر آپ اپنے اصحاب میں سے کسی کو فوج کا سردار بنا کر بھیج دیا کرتے تھے ان کو "سریہ" کہا جاتا ہے، غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے، جن میں بدر، احد، خندق، خیبر اور حنین بہت مشہور ہیں اور سریوں کی تعداد چھتیس تھی جن میں سب سے مشہور جنگ موتہ ہے جس میں جعفر طیار شہید ہوئے۔

**صلح حدیبیہ** بدر و احد کی لڑائیوں کے بعد کچھ عرصہ تک مشرکین مکہ

کی طرف سے کوئی جنگی کارروائی نہیں ہوئی، تو ہجرت کے چھٹے سال حضرتؐ نے مکہ معظمہ کے حج کا ارادہ کیا اور مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے مگر جب قریشیوں کو رسولؐ کی آمد کی اطلاع ہوئی تو وہ مکہ سے باہر نکل کر رسولؐ کا راستہ روکنے پر تیار ہوئے اور انھوں نے کہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے آپ کا شہر مکہ میں ورود نہیں دیکھ سکتے۔ مکہ والوں کا یہ جارحانہ اقدام دیکھ کر رسولؐ نے امن پسندی سے کام لیتے ہوئے ان کے ساتھ ایک تحریری صلحنامہ کر دیا۔ اس صلح کے کاتب حضرت علی بن ابی طالبؑ تھے۔ اس کے شرائط حسب ذیل تھے:۔

(۱) رسولؐ اس سال مع اپنے متبعین کے بغیر حج کیے ہوئے واپس جائیں۔

(۲) دس سال تک آپس میں کوئی جنگ نہ ہو۔

(۳) اگر مکہ والوں میں سے کوئی جاکر مسلمانوں میں شامل ہو جائے تو مسلمانوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اُسے واپس کر دیں۔

(۴) اگر کوئی مسلمان بھاگ کر مشرکین کے پاس آ جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔

(۵) عرب کے تمام قبیلوں کو اختیار ہے کہ چاہے وہ رسولِ اسلامؐ کے ساتھ معاہدہ کر لیں یا مکہ والوں کے ساتھ ہو جائیں۔

(۶) سال آئندہ مسلمانوں کو مکہ کی زیارت کا حق حاصل ہوگا، لیکن وہ وہاں تین روز سے زیادہ قیام نہیں کر سکیں گے۔

(۷) مسلمان اس موقع پر اپنے سفری اسلحہ کے ساتھ یعنی تلواروں کو غلاف میں رکھ کر آسکیں گے۔

بعض مسلمان اس معاہدہ کے غیر منصفانہ شرائط پر بڑی ناراضگی کا اظہار کر رہے تھے، مگر حضرت رسولؐ نے اس لیے کہ جارحانہ حملہ کا الزام آپ پر عائد نہ ہو، ان شرائط پر صلح کر کے مکہ سے واپسی اختیار کی اور دوسرے سال معاہدہ کے مطابق حج کے لیے تشریف لے گئے اور حسب معاہدہ تین دن کے بعد مکہ کو چھوڑ دیا اور مدینہ واپس چلے گئے

**فتح مکہ** کچھ ہی عرصہ کے بعد مکہ والے اس معاہدہ پر جو رسول اللہؐ کے ساتھ کیا گیا تھا قائم نہیں رہے اور قبیلۂ خزاعہ کو جو پیغمبر اسلامؐ کا حلیف تھا بکر کے قبیلہ نے جو مشرکین کا حلیف تھا تہ تیغ کر دیا جب حضرتؐ کو یہ معلوم ہوا تو آپ اپنے حلیف قبیلہ کی امداد کے لیے فوراً روانہ ہو گئے اور دس ہزار مسلمانوں کی فوج کے ساتھ مکہ کے قریب پہونچ کر خیمہ زن ہوئے۔ مشرکین میں اب مقابلہ کی طاقت باقی نہ تھی انھوں نے ہتھیار ڈال دینا مناسب سمجھا اور ماہ رمضان ۸ھ میں آپ فاتحانہ شان سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے، اب پیغمبر اسلامؐ کا رحم و کرم دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ان لوگوں کی جن سے آپ کو سخت تکلیفیں پہونچی تھیں جن کی وجہ سے آپ کو اپنا وطن عزیز چھوڑنا پڑا تھا، فتح مکہ کے وقت تمام خطائیں معاف کر دی گئیں۔ فتح کے موقع پر جب لوگ آپ کی بیعت کر رہے تھے تو آپ نے ان سے پوچھا کہ بتاؤ تم مجھ سے کیا امید رکھتے ہو،

سب نے جواب دیا کہ ہمیں اچھائی ہی کی امید ہے۔ آپ فیاض بھائی ہیں اور فیاض بھائی کے فرزند ہیں۔ آپ نے فرمایا جاؤ تم لوگ آزاد ہو۔ دنیا کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ رسول خداؐ نے ابوسفیان کو اُس کی بیوی ہندہ کو جس نے حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کا کلیجہ نکلوا کر چبایا تھا، وحشی کو جس نے حمزہؓ کو شہید کیا تھا، عکرمہ ابوجہل کے بیٹے اور ایسے ہی کئی اشخاص کو جنھوں نے سخت ایذائیں پہونچائی تھیں اور شدید جرائم کے مرتکب ہوئے تھے، آج ظاہری اسلام قبول کرنے کے بعد بغیر کسی شرط کے معاف کر دیا۔ فتح کے بعد حضرتؐ نے ڈیڑھ ماہ مکہ میں قیام فرمایا، اور ملکی انتظام کے لیے وہ اصول جاری کیے جو مہذب قوموں کی تہذیب کی آج بھی نشانی بن سکتے ہیں۔

**حجۃ الوداع** سنہ ۱۰ھ میں حضرتؐ نے اپنی زندگی کا آخری حج کیا ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ بڑی شان و شوکت کے ساتھ ارکان حج ادا کیے۔

واپسی میں مقام غدیر خم پر تمام اطراف و جوانب کے مسلمانوں کے مجمع میں یادگار تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا، جس میں آپ نے اپنی وفات کے قریب ہونے کی دردناک خبر سناتے ہوئے اُن سے اس طرح اقرار لیا کہ میں تمھارے بارے میں خود تم سے زیادہ اختیارات رکھتا ہوں یا نہیں جب سب نے تسلیم کیا کہ بے شک آپ ہم پر ہم سے زیادہ

اختیارات رکھتے ہیں، تو آپ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کے سامنے اونچا کیا اور فرمایا کہ جو اختیارات مجھے تمھاری نسبت حاصل ہیں وہی علی کو تمھاری نسبت حاصل ہوں گے اس طرح آپ نے اپنے بعد کے لیے اپنے جانشین کے نام کا اعلان فرمایا۔ مسلمانوں نے اس پر بڑی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا اور عام طور سے اس وقت علیؑ رسولؐ کے جانشین تسلیم کر لیے گئے۔

## اصول تعلیم اور اخلاق وخصائل

پیغمبر اسلامؐ کی تعلیم کا خاص جوہر تمام افراد انسانی کی نگاہ کو مادیت کے احاطہ سے نکال کر ایک غیبی طاقت کی طرف متوجہ کرنا تھا۔ جس کے لحاظ سے تمام افراد انسانی یکساں حیثیت رکھتے ہیں، خالق کی توحید اور خلائق کا اتحاد یہ ہی دو وہ بنیادی اصلیں تھیں جن پر حقوق اللہ اور حقوق الناس کی عمارت بلند ہوئی اور تاریخ انسانی میں پہلے پہل شہری اور انسانی حقوق پورے طور پر عام انسانوں کو بالعموم عطا ہوئے جن سے وہ قومیت، رنگ، جنس یا غربت و فلاکت کی بنا پر محروم رکھے جاتے تھے اس نے پہلے کے تمام تفوق اور بلندی کے امتیازات مٹا کر ایک نیا امتیاز کا معیار قائم کیا اور وہ یہ کہ افضلیت اعمال و افعال کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ جو شخص فرائض انسانی کو سب سے زیادہ انجام دیتا ہو وہ سب سے بہتر ہے۔

اخلاق پر بہت زور دیا، حضرت فرماتے تھے کہ "میں بھیجا گیا ہوں

صرف اچھے اخلاق کی تکمیل کے لیے،" آپ کے ذاتی اخلاق وخصائل بھی اسی مقصد کے ترجمان تھے آپ اتنی بڑی اسلامی جماعت کے سردار ہوتے ہوئے فقرائے مدینہ کے ساتھ زانو سے زانو ملا کر بیٹھتے اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو جاتے تھے، رات رات بھر عبادت خدا ہوتی تھی اتنی کہ پیروں پر ورم آجاتا تھا اور دن بھر قبائل عرب اور مختلف شہروں کے وفود سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ مسائل کا تصفیہ ہوتا تھا اور بڑے بڑے قضیے حل کیے جاتے تھے، ایک انگریز مؤرخ (باسورتھ اسمتھ) نے لکھا ہے کہ "تاریخ میں محمدؐ کی سی ہستی بیک وقت تین فرائض انجام دیتی ہوئی نہیں مل سکتی یعنی کہ محمدؐ ایک قوم کے بانی ہوئے۔ ایک نئے نظام سلطنت کے بانی ہوئے اور ایک مذہب کے بانی ہوئے ہیں۔ ایسی مثال کوئی دوسری نہیں مل سکتی"، اس کے ساتھ آپ نے کبھی اپنے کو بادشاہ کہا جانا یا سمجھا جانا پسند نہیں کیا بلکہ اس سے انکار فرمایا۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا جوں ہی آپ کے سامنے کھڑا ہوا، رعب سے کانپنے لگا، آپ نے فرمایا "اپنے آپے میں آؤ، میں کوئی بادشاہ نہیں ہوں، میں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو شوربے میں روٹی کو چورا کر کے (غریبا مئو) کھانا کھاتی تھی"، اسی مناسبت سے آپ کی عادتیں نہایت سادہ تھیں۔ تعمیر کے وقت مزدوروں کی طرح کام کرتے، بازار سے اپنا سودا خرید کر لاتے بلکہ ہمسایوں کو بھی خرید کر لا دیتے تھے، عفو و کرم آپ کا خاصہ اور سختیوں کو ہمت کے ساتھ برداشت

کرنا اور عزم و اطمینان کے ساتھ عمل کے جادہ پر قائم رہنا آپ کی سیرت میں نمایاں تھا۔

آپ کا عمل آپ کی تعلیم کا مفسر اور آپ کی تعلیم آپ کے عمل کا خلاصہ تھی۔ آپ کے طرز بیان کی خاص خصوصیت جامعیت تھی۔ چھوٹے چھوٹے جملوں میں آپ نے وہ اصول ودیعت کر دیے ہیں جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کرتے ہیں۔

**قرآن مجید** قرآن حقائق و معارف کا وہ خزانہ اور حیات انسانی کا وہ مکمل دستور ہے جو آپ کے ذریعہ سے اہل عالم کی ہدایت کے لیے پیش ہوا اور کروڑوں انسانوں نے اس وقت سے اب تک اُس کے تعلیمات سے فیض حاصل کیا اور ہزاروں ایسے افراد نے بھی جو مذہبی طور سے اس پر ایمان کا اقرار نہیں رکھتے اس کی بلندی کا اعتراف کیا ہے

**وفات** دوشنبہ کا دن دوسری ربیع الاول ۱۱ھ یا ایک قول کی بنا پر ۲۸ صفر کی وہ قیامت خیز تاریخ تھی، جب چند روز بیمار رہنے کے بعد مصلح عالم پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا سے رحلت فرمائی۔ آپ کی حسب وصیت آپ کے بھائی اور جانشین حضرت علی بن ابی طالبؑ نے آپ کی تجہیز و تکفین فرمائی اور آپ کی مسجد کے پاس اسی حجرہ میں جہاں آپ کی وفات ہوئی تھی دفن کیا۔

مدینہ منورہ میں آپ کا قبۂ خضرا، مسلمانانِ عالم کی زیارت گاہ ہے۔ جہاں وہ مکہ معظمہ کے حج سے پہلے یا بعد جاتے ہیں، اور مسجد نبویؐ و روضۂ رسولؐ کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔

# حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام

**نام و نسب** حضرت علیؑ آل ابراہیمؑ ہیں قریش کی نسل سے بنی ہاشم کے ممتاز گھرانے میں عبد المطلب کے فرزند ابو طالبؑ کے چشم و چراغ تھے۔ صرف ایک واسطے سے آپ کا نسب حضرت پیغمبر خدا محمد مصطفےٰؐ سے مل جاتا ہے۔ وہ محمدؐ ابن عبداللہ ابن عبدالمطلب اور یہ علی ابن ابی طالبؑ ابن عبدالمطلب آپ کے والد ابو طالب ہی نے رسول اللہؐ کی پرورش بھی کی تھی۔ اور آپ کی والدہ فاطمہ بنت اسد بھی ہاشمی ہی خاندان کی معزز خاتون تھیں جنھیں حضرت پیغمبر خداؐ مثل اپنی ماں کے سمجھتے تھے۔

**ولادت** پیغمبر خداؐ کی عمر تیس برس کی تھی جب خانہ کعبہ ایسے مقدس مقام پر ۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل میں علیؑ کی ولادت ہوئی۔ آپ کے والد ابو طالب اور ماں فاطمہ بنت اسد کو جو خوشی ہونا چاہیے تھی وہ تو ہوئی ہی مگر سب سے زیادہ رسول اللہؐ اس بچے کو دیکھ کر خوش ہوئے، شاید بچے کے خط و خال سے اسی وقت یہ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ آئندہ چل کر رسولؐ کا قوت بازو اور دست راست ثابت ہوگا۔

**تربیت** علیؑ کی پرورش براہ راست حضرت محمد مصطفےٰؐ کے ذمہ ہوئی آپ نے انتہائی محبت اور توجہ سے اپنا پورا وقت

اس چھوٹے بھائی کی علمی اور اخلاقی تربیت میں صرف کیا، ذاتی جوہر اور پھر رسولؐ ایسے بلند مرتبہ مربی کا فیض تربیت چنانچہ علی دس ہی برس کے سن میں ایسے تھے کہ پیغمبرؐ کے دعوائے رسالت کرنے پر ان کے سب سے پہلے پیرو بلکہ ان کے دعوے کے گواہ قرار پائے۔

**بعثت** علیؑ کا دس برس کا سن تھا جب حضرت محمد مصطفےٰؐ عملی طور پر پیغام الٰہی کے پہونچانے پہ مامور ہوئے اسی کو بعثت کہتے ہیں۔

زمانہ، ماحول، شہر، اپنی قوم اور خاندان سب کے خلاف ایک ایسی مہم شروع کی جارہی تھی جس میں رسولؐ کا ساتھ دینے والا کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا، بس ایک علیؑ تھے کہ جب پیغمبرؐ نے رسالت کا دعوےٰ کیا تو علیؑ نے سب سے پہلے اس کی تصدیق کی اور ایمان کا اقرار کیا۔ دوسری ذات جناب خدیجۂ کبریٰ کی تھی، جنھوں نے خواتین کے طبقہ میں سبقت اسلام کے اس شرف کو حاصل کیا۔

**دورِ ابتلا** پیغمبرؐ کا دعوائے رسالت کرنا تھا کہ ہر ہر ذرہ رسولؐ کا دشمن نظر آنے لگا وہی لوگ جو کل تک آپ کی سچائی اور امانت داری کا دم بھرتے رہے تھے۔ آج آپ کو (معاذاللہ) دیوانہ جادوگر، اور نہ جانے کیا کیا کہنے لگے، راستوں میں کانٹے بچھائے جاتے، پتھر مارے جاتے اور سر پہ کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا، اس سخت وقت میں رسولؐ کا ہر مصیبت میں شریک صرف ایک بچہ تھا۔ وہی علیؑ

جس نے بھائی کا ساتھ دینے میں کبھی ہمت نہیں ہاری، برابر محبت و وفاداری کا دم بھرتے رہے۔ ہر ہر بات میں رسولؐ کے سینہ سپر رہے یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا جب مخالف گروہ نے انتہائی سختی کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ پیغمبرؐ کا اور ان کے تمام گھرانے والوں کا بائیکاٹ کیا جائے، حالات اتنے خراب تھے کہ جانوں کے لالے پڑ گئے تھے۔ ابو طالبؑ نے تمام اپنے ساتھیوں کو حضرت محمد مصطفےٰؐ سمیت ایک پہاڑ کے دامن میں محفوظ قلعہ میں بند کردیا۔ تین برس تک یہ قید و بند کی زندگی بسر کرنا پڑی اس میں ہر شب یہ اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن شب خون نہ مارے۔ اس لیے ابو طالبؑ نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ رات بھر رسولؐ کو ایک بستر پر نہیں رہنے دیتے تھے، بلکہ کبھی جعفرؑ کو رسولؐ کے بستر پر اور رسولؐ کو جعفرؑ کے بستر پر لٹا دیتے تھے، کبھی عقیل کو رسولؐ کے بستر پر اور رسولؐ کو عقیل کے بستر پر اور اسی طرح کبھی علیؑ کو رسولؐ کے بستر پر لٹاتے تھے اور رسولؐ کو علیؑ کے بستر پر، مطلب یہ تھا کہ اگر دشمن رسولؐ کے بستر کا پتہ لگا کر حملہ کرنا چاہے تو میرا جو بھی بیٹا چاہے قتل ہو جائے مگر رسولؐ کا بال بیکا نہ ہو۔ اس طرح علیؑ بچپنے ہی سے فداکاری اور جاں نثاری کے سبق کو عملی طور پر دہراتے رہے۔

اس کے بعد وہ وقت آیا کہ ابو طالبؑ کی وفات ہو گئی، اور اس جاں نثار چچا کی وفات سے پیغمبرؐ کا دل ٹوٹ گیا، اور آپ نے مدینہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کرلیا جس پر دشمنوں نے ایکا کیا کہ

**ہجرت**

ایک رات جمع ہو کر پیغمبرؐ کے گھر کو گھیر لیں اور حضرت کو شہید کر ڈالیں حضرت کو اس کی اطلاع ہوئی، تو آپ نے اپنے اسی جاں نثار بھائی علیؑ کو بلا کر اس واقعہ کی اطلاع دی اور فرمایا کہ میری جان کی رکھوالی یوں ہو سکتی ہے کہ تم آج کی رات میرے بستر پر میری چادر اُوڑھ کر سو رہو اور میں مخفی طور پر مکہ سے روانہ ہو جاؤں، کوئی دوسرا ہوتا تو یہ پیغام سنتے ہی اس کا دل ہل جاتا، مگر علیؑ نے یہ سن کر کہ میرے ذریعہ سے رسولؐ کی جان کی حفاظت ہوگی، خدا کا شکر ادا کیا اور بہت خوش ہوئے کہ مجھے رسولؐ کا فدیہ قرار دیا جا رہا ہے، یہی ہوا کہ رسالت مآبؐ شب کے وقت مکہ معظمہ سے مدینہ کی طرف روانہ ہو گئے اور علی ابن ابیطالبؑ رسولؐ کے بستر پر سوئے، چاروں طرف خون کے پیاسے دشمن تلواریں کھینچے نیزے لیے ہوئے مکان کو گھیرے ہوئے تھے، بس اس بات کی دیر تھی کہ ذرا صبح ہو اور سب کے سب گھر میں گھس کر رسالتمآبؐ کو شہید کر ڈالیں، علیؑ اطمینان کے ساتھ بستر پر آرام کرتے رہے، اور ذرا بھی اپنی جان کا خیال نہ کیا، دشمنوں کو صبح کے وقت یہ معلوم ہوا کہ محمدؐ نہ تھے، علیؑ تھے، انھوں نے آپ پر یہ دباؤ ڈالنا چاہا کہ آپ بتلا دیں کہ رسولؐ کہاں گئے ہیں، مگر علیؑ نے بڑے بہادرانہ تیوروں سے یہ بتلانے سے قطعی انکار کر دیا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت رسول اللہؐ مکہ سے کافی دور تک بغیر کسی پریشانی اور رکاوٹ کے تشریف لے جا سکے علیؑ تین روز تک مکہ میں رہے جن جن کی امانتیں رسول اللہؐ کے پاس تھیں

اُن تک اُن کی امانتوں کو پہونچا کر خواتین بیتِ رسالت کو اپنے ساتھ لے کر مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ کئی روز تک آپ رات دن پیدل چل کر اس طرح کہ پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ مدینہ میں رسولؐ کے پاس پہونچے۔ اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ علیؑ پر رسولؐ کو سب سے زیادہ اعتماد تھا، جس وفاداری، ہمت اور دلیری سے علیؑ نے اس ذمہ داری کو پورا کیا ہے وہ بھی اپنی آپ مثال ہے۔

**شادی** رسولؐ نے مدینے میں آ کر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی اکلوتی بیٹی فاطمہ زہراؑ کا عقد علیؑ کے ساتھ کر دیا۔ رسولؐ اپنی بیٹی کو انتہائی عزیز رکھتے تھے اور عزت اتنی کرتے تھے کہ جب فاطمہ زہراؑ آتی تھیں تو رسولؐ تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ہر شخص اس بات کا طلبگار تھا کہ رسولؐ کی اس معزز بیٹی کے ساتھ منسوب ہونے کا شرف اسے حاصل ہو۔ دو ایک نے ہمت بھی کی کہ وہ رسولؐ کو پیغام دیں مگر حضرتؐ نے سب کی خواہشوں کو رد کر دیا اور یہ کہا کہ فاطمہؑ کی شادی بغیر حکم خدا کے نہیں ہو سکتی۔ ہجرت کا پہلا سال تھا جب رسولؐ نے علیؑ کو اس عزت کے لیے منتخب کیا، یہ شادی نہایت سادگی کے ساتھ انجام دی گئی۔ شہنشاہ دین و دنیا حضرت پیغمبر خداؐ کی بیٹی اور اس کو پیغمبرؐ کی طرف سے جہیز بھی نہیں دیا گیا، خود فاطمہؑ کا مہر تھا جو علیؑ سے لے کر کچھ سامان خانہ داری فاطمہؑ کے لیے خرید کر ساتھ کر دیا گیا، وہ بھی کیا؟ مٹی کے کچھ برتن، خرمے کی چھال کے تکیے۔ چمڑے کا بستر،

اور چرخہ، چکی اور پانی بھرنے کی مشک، اس طرح کا سامان دیا گیا، علیؑ نے مہر ادا کرنے کے لیے اپنی زرہ فروخت کی اور اس سے فاطمہ زہراؑ کا مہر ادا کیا جو ایک سو سترہ تولے چاندی سے زیادہ نہ تھا، اس طرح مسلمانوں کے واسطے ہمیشہ کے لیے ایک مثال قائم کر دی گئی کہ وہ اپنے تقریبات کے سلسلہ میں فضول خرچی سے کام نہ لیں

**خانہ داری** فاطمہؑ اور علیؑ کی زندگی گھریلو زندگی کا ایک بے مثال نمونہ تھی، مرد اور عورت آپس میں کس طرح ایک دوسرے کے شریک حیات ثابت ہو سکتے ہیں آپس میں کس طرح تقسیم عمل ہونا چاہیے اور کیونکر دونوں کی زندگی ایک دوسرے کے لیے مددگار ہو سکتی ہے، وہ گھر دنیا کی آرائشوں سے دور، راحت طلبی اور تن آسانی سے بالکل علیحدہ تھا، محنت اور مشقت کے ساتھ ساتھ دلی اطمینان اور آپس کی محبت و اعتماد کے لحاظ سے ایک جنت بنا ہوا تھا جہاں سے علیؑ صبح کو مشکیزہ لے کر جاتے تھے اور یہودیوں کے باغ میں پانی دیتے تھے اور جو کچھ مزدوری ملتی تھی اسے لے کر گھر پر آتے تھے بازار سے جو خرید کر فاطمہؑ کو دیتے تھے اور فاطمہؑ چکی پیستی، کھانا پکاتی اور گھر میں جھاڑو دیتی تھیں۔ فرصت کے اوقات میں چرخہ چلاتی تھیں اور خود اپنے اور اپنے گھر والوں کے لباس کے لیے اور کبھی مزدوری کے طور پر سوت کاتتی تھیں اور اس طرح گھر میں رہ کر زندگی کی مہم میں اپنے شوہر کا ہاتھ بٹاتی تھیں۔

جہاد کی مکہ میں آ کر پیغمبرؐ کو مخالف گروہ نے آرام سے بیٹھنے نہ دیا

آپ کے وہ پیرو جو مکہ میں تھے انھیں طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں، بعض کو قتل کیا، بعض کو قید کیا اور بعض کو زد و کوب کیا، اور تکلیفیں پہونچائیں، یہی نہیں بلکہ اسلحہ اور فوج جمع کر کے خود رسولؐ کے خلاف مدینہ پر چڑھائی کر دی، اس موقع پر رسولؐ کا اخلاقی فرض تھا کہ وہ مدینہ والوں کے گھروں کی حفاظت کرتے جنھوں نے کہ آپ کو انتہائی ناگوار حالات میں پناہ دی تھی۔ اور آپ کی نصرت و امداد کا وعدہ کیا تھا۔ آپ نے یہ کسی طرح پسند نہ کیا کہ آپ شہر کے اندر گھِر کر مقابلہ کریں، اور دشمن کو یہ موقع دیں کہ وہ مدینہ کی پُرامن آبادی اور عورتوں اور بچّوں کو بھی پریشان کر سکے، گو آپ کے ساتھ تعداد بہت کم تھی صرف تین سو تیرہ آدمی تھے ہتھیار بھی نہ تھے، مگر آپ نے یہ طے کر لیا کہ آپ باہر نکل کر دشمن سے مقابلہ کریں گے۔ چنانچہ پہلی لڑائی اسلام کی ہوئی، جو جنگ بدر کے نام سے مشہور ہے، اس لڑائی میں رسولؐ نے زیادہ اپنے عزیزوں کو خطرے میں ڈالا، چنانچہ آپ کے چچازاد بھائی عبیدہ ابن حارث ابن عبدالمطلب اس جنگ میں شہید ہوئے۔ علی بن ابی طالبؑ کو جنگ کا یہ پہلا تجربہ تھا ۲۵ برس کی عمر تھی، مگر جنگ کی فتح کا سہرا علیؑ کے سر رہا، جتنے مشرکین قتل ہوئے تھے اُن میں سے آدھے صرف علیؑ کے ہاتھ کے مقتول تھے اور آدھے تمام مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ اس کے بعد اُحد، خندق، خیبر اور آخر میں حنین یہ وہ بڑی لڑائیاں ہیں جن میں علیؑ نے

رسولؐ کے ساتھ رہ کر اپنی بے نظیر بہادری کے جوہر دکھلائے۔ تقریباً ان تمام لڑائیوں میں علیؑ کو علمداری کا عہدہ بھی حاصل رہا۔ اس کے علاوہ بہت سی لڑائیاں ایسی تھیں جن میں رسولؐ نے علیؑ کو تنہا بھیجا، اور انھوں نے اکیلے فتح بھی حاصل کی۔ ان تمام لڑائیوں میں حضرت علیؑ نے بڑی بہادری اور ثابت قدمی دکھائی اور انتہائی استقلال، تحمل اور شرافت نفس سے کام لیا، جس کا اقرار خود ان کے دشمن بھی کرتے تھے، خندق کی لڑائی میں دشمن کے سب سے بڑے سورما عمرو بن عبدود کو جب آپ نے مغلوب کر لیا اور اس کا سر کاٹنے کے لیے اس کے سینے پر بیٹھے تو اس نے آپ کے چہرے پر لعاب دہن پھینک دیا آپ کو غصہ آگیا۔ اور آپ اس کے سینے پر سے اتر آئے۔ صرف اس خیال سے کہ اگر غصے میں اس کو قتل کیا تو یہ فعل محض خدا کی راہ میں نہ ہوگا بلکہ اپنی خواہش نفس کے مطابق ہوگا۔ کچھ دیر کے بعد آپ نے اس کو قتل کیا۔ اس زمانے میں دشمن کو ذلیل کرنے کے لیے اس کی لاش کو برہنہ کر دیتے تھے، مگر حضرت علیؑ نے اس کی زرہ نہیں اُتاری، اگرچہ وہ بہت قیمتی تھی۔ چنانچہ اس کی بہن جب اپنے بھائی کی لاش پر آئی تو اُس نے کہا کہ کسی اور نے میرے بھائی کو قتل کیا ہوتا تو میں عمر بھر روتی، مگر مجھے یہ دیکھ کر صبر آگیا کہ اس کا قاتل علیؑ کا سا شریف انسان ہے، جس نے اپنے دشمن کی لاش کی توہین گوارا نہیں کی، آپ نے کبھی دشمن کی عورتوں یا بچوں پر ہاتھ نہیں اُٹھایا اور کبھی

مال غنیمت کی طرف رُخ نہیں کیا۔

**خدمات** علاوہ جہاد کے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے لیے کسی کام کے کرنے میں آپ کو انکار نہ تھا، یہ کام مختلف طرح کے تھے، رسولؐ کی طرف سے عہد ناموں کا لکھنا، خطوط تحریر کرنا آپ کے ذمہ تھا اور لکھے ہوئے اجزائے قرآن کے امانت دار بھی آپ تھے، اس کے علاوہ یمین کی جانب تبلیغ اسلام کے لیے پیغمبرؐ نے آپ کو روانہ کیا جس میں آپ کی کامیاب تبلیغ کا اثر یہ تھا کہ سارا یمن مسلمان ہو گیا۔ جب سورۂ برارت نازل ہوا تو اس کی تبلیغ کے لیے بحکم خدا آپ ہی مقرر ہوئے اور آپ نے جا کر مشرکین کو سورۂ برارت کی آیتیں سُنائیں، اس کے علاوہ رسالت مآبؐ کی ہر خدمت انجام دینے پر تیار رہتے تھے، یہاں تک کہ یہ بھی دیکھا گیا کہ رسولؐ کی جوتیاں اپنے ہاتھ سے سی رہے ہیں، علیؑ اسے اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے

حضرت علیؑ کے امتیازی صفات اور خدمات کی بنا پر رسولؐ انکی بہت عزت **اعزاز** کرتے تھے اور اپنے قول اور فعل سے ان کی خوبیوں کو ظاہر کرتے رہتے تھے۔ کبھی یہ کہتے تھے کہ "علیؑ مجھ سے ہیں اور میں علیؑ سے ہوں۔" کبھی یہ کہا کہ "میں علم کا شہر ہوں اور علیؑ اس کا دروازہ ہے۔" کبھی یہ کہ "تم سب میں بہترین فیصلہ کرنے والا علیؑ ہے۔" کبھی یہ کہ "علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارون کو موسےٰؑ سے تھی۔" کبھی یہ کہ "علیؑ مجھ سے وہ تعلق رکھتے ہیں جو روح کو جسم سے یا سر کو بدن سے

ہوتا ہے"۔ کبھی یہ کہ" وہ خدا ؤ رسولؐ کے سب سے زیادہ محبوب ہیں"
یہاں تک کہ مباہلہ کے واقعہ میں علیؑ کو نفسِ رسولؐ کا خطاب ملا۔ عملی
اعزاز یہ تھا کہ مسجد میں سب کے دروازے بند ہوئے تو علیؑ کا دروازہ
کھلا رکھا گیا۔ جب مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کیا گیا، تو علیؑ کو
پیغمبرؐ نے اپنا دنیا و آخرت کا بھائی قرار دیا، اور سب سے آخر میں
غدیر خم کے میدان میں ہزاروں مسلمانوں کے مجمع میں علیؑ کو اپنے ہاتھوں
پر بلند کر کے یہ اعلان فرما دیا کہ "جس طرح میں مسلمانوں کا سرپرست
اور حاکم ہوں، اسی طرح علیؑ سب کے سرپرست اور حاکم ہیں"۔ یہ
اتنا بڑا اعزاز تھا کہ تمام مسلمانوں نے علیؑ کو مبارکبادیں دیں۔ اور
سب نے سمجھ لیا کہ پیغمبرؐ نے علیؑ کی ولی عہدی اور جانشینی کا
اعلان کر دیا ہے۔

**رسولؐ کی وفات** } ہجرت کو دس برس پورے ہوئے تھے، جب پیغمبر خداؐ اُس بیماری میں مبتلا ہوئے
جو مرض الموت ثابت ہوئی، یہ خاندانِ رسولؐ کے لیے ایک قیامت
خیز مصیبت کا وقت تھا۔ علیؑ رسولؐ کی بیماری میں برابر پاس
موجود رہتے اور تیمارداری میں مصروف رہتے تھے، اور رسولؐ بھی
علیؑ کا اپنے پاس سے ہٹنا ایک لمحہ کے لیے گوارا نہ کرتے تھے
یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب رسولؐ عالمِ احتضار میں تھے۔ آپ
نے علیؑ کو اپنے پاس بُلایا اور سینے سے لگا کے بہت دیر تک آہستہ آہستہ

باتیں کرتے رہے اور ضروری وصیتیں فرمائیں، اس گفتگو کے بعد بھی علیؑ کو اپنے سے جدا نہ ہونے دیا، اور ان کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ لیا، جس وقت رسولؐ کی روح جسم سے جدا ہوئی ہے اس وقت بھی علیؑ کا ہاتھ رسولؐ کے سینے پر رکھا ہوا تھا۔

**بعد رسولؐ** جس نے زندگی بھر پیغمبرؐ کا ساتھ دیا وہ بعد رسولؐ آپ کی لاش کو کس طرح چھوڑتا، چنانچہ رسولؐ کی تجہیز و تکفین اور غسل و کفن کا تمام کام علیؑ ہی کے ہاتھوں ہوا اور قبر میں بھی آپ ہی نے رسولؐ کو اتارا۔ رسولؐ کے دفن سے فرصت ہونے کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اتنی دیر میں پیغمبرؐ کی جانشینی کا انتظام ہو گیا ہے۔ اگر کوئی دوسرا انسان ہوتا تو جنگ آزمائی پر تیار ہو جاتا، مگر علیؑ کو اسلامی مفاد اتنا عزیز تھا کہ آپ نے اپنے حقوق کے اعلان کے باوجود اپنی طرف سے مسلمانوں میں خانہ جنگی پیدا نہیں ہونے دی، نہ صرف یہ کہ آپ نے معرکہ آرائی نہیں چاہی، بلکہ جس وقت ضرورت پڑی، اس وقت اسلامی مفاد کی خاطر آپ نے امداد دینے سے دریغ بھی نہیں کی، مشکل مسائل کے فیصلہ و ضروری مشورہ لیے جانے پر اپنی مفید رائے کے اظہار سے کبھی پہلو نہیں بچایا، اس کے علاوہ بہ طور خود خاموشی کے ساتھ اسلام کی روحانی اور علمی خدمت میں مصروف رہے۔ قرآن کو ترتیب نزول کے مطابق ناسخ و منسوخ اور محکم اور متشابہ کی تشریح کے ساتھ مرتب کیا۔ مسلمانوں کے علمی طبقے میں تصنیف و تالیف کا ادر

علمی تحقیق کا ذوق پیدا کیا اور خود بھی تفسیر اور کلام اور فقہ و احکام کے بارے میں ایک مفید علمی ذخیرہ فراہم کیا۔ بہت سے ایسے شاگرد تیار کیے جو مسلمانوں کی آئندہ علمی زندگی کے لیے معمار کا کام انجام دے سکیں، زبان عربی کی حفاظت کے لیے علم نحو کی داغ بیل ڈالی، اور فن صرف اور معانی بیان کے اصول کو بھی بیان کیا۔ اس طرح یہ سبق دیا کہ اگر ہوائے زمانہ مخالف بھی ہو اور اقتدار نہ بھی تسلیم کیا جائے تو انسان کو گوشہ نشینی اور کس مپرسی میں بھی اپنے فرائض کو فراموش نہ کرنا چاہیے۔ ذاتی اعزاز اور منصب کی خاطر مفاد ملی کو نقصان نہ پہونچایا جائے، اور جہاں تک ممکن ہو انسان اپنی ملت، قوم اور مذہب کی خدمت ہر حال میں کرتا رہے۔

**خلافت**

پچیس برس تک رسولؐ کے بعد علیؑ نے خانہ نشینی میں بسر کی، ۳۵ھ میں مسلمانوں نے خلافت اسلامی کا منصب علیؑ کے سامنے پیش کیا۔ آپ نے پہلے انکار کیا، لیکن جب مسلمانوں کا اصرار بہت بڑھ گیا، تو آپ نے اس شرط سے منظور کیا کہ میں بالکل قرآن اور سنت پیغمبرؐ کے مطابق حکومت کروں گا، اور کسی اور رعایت سے کام نہ لوں گا۔ مسلمانوں نے اس شرط کو منظور کیا، اور آپ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی، مگر زمانہ آپ کی خالص مذہبی سلطنت کو برداشت نہ کرسکا، آپ کے خلاف بنی امیہ اور بہت سے وہ لوگ کھڑے ہوگئے جنھیں آپ کی مذہبی

حکومت میں اپنے اقتدار کے زائل ہونے کا خطرہ تھا، آپ نے ان سب سے مقابلہ کرنا اپنا فرض سمجھا، اور جمل اور صفین اور نہروان کی خوں ریز لڑائیاں ہوئیں۔ جن میں علیؑ بن ابی طالبؑ نے اُسی شجاعت اور بہادری سے جنگ کی جو بدر و اُحد، خندق و خیبر میں کسی وقت دیکھی جا چکی تھی اور زمانہ کو یاد تھی۔ ان لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے آپ کو موقع نہ مل سکا کہ آپ کا جیسا دل چاہتا تھا اس طرح اصلاح فرمائیں۔ پھر بھی آپ نے اس مختصر مدت میں اسلام کی سادہ زندگی، مساوات اور نیک کمائی کے لیے محنت و مزدوری کی تعلیم کے نقش تازہ کر دیے، آپ شہنشاہ اسلام ہونے کے باوجود کھجوروں کی دوکان پر بیٹھنا اور اپنے ہاتھ سے کھجوریں بیچنا بُرا نہیں سمجھتے تھے، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے تھے، غریبوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے، جو روپیہ بیت المال میں آتا تھا اُسے تمام مستحقین پر برابر سے تقسیم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے سگے بھائی عقیل نے یہ چاہا کہ کچھ انھیں دوسرے مسلمانوں سے زیادہ مل جائے مگر آپ نے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر میرا ذاتی مال ہوتا تو خیر یہ بھی ہو سکتا تھا، مگر یہ تمام مسلمانوں کا مال ہے مجھے حق نہیں ہے کہ میں اس میں سے کسی اپنے عزیز کو دوسروں سے زیادہ دوں، انتہا ہے کہ اگر کبھی بیت المال میں شب کے وقت حساب و کتاب میں

مصروف ہوئے اور کوئی ملاقات کے لیے آکر غیر متعلق باتیں کرنے لگا تو آپ نے چراغ بڑھا دیا کہ بیت المال کے چراغ کو میرے ذاتی کام میں صرف نہ ہونا چاہیے۔ آپ کی کوشش یہ رہتی تھی کہ جو کچھ بیت المال میں آئے وہ جلد سے جلد حق داروں تک پہونچ جائے، آپ اسلامی خزانے میں مال کا جمع رکھنا پسند نہیں فرماتے تھے۔

**شہادت** افسوس ہے کہ یہ امن، مساوات اور اسلامی تمدن کا علمبردار دنیا طلب لوگوں کی عداوت سے نہ بچا اور ۱۹ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ کو صبح کے وقت خدا کے گھر یعنی مسجد میں عین حالت نماز میں ایک زہر میں بجھی ہوی تلوار سے زخمی کیا گیا۔ آپ کے رحم و کرم اور مساوات پسندی کی انتہا یہ تھی کہ جب آپ کے قاتل کو گرفتار کر کے آپ کے سامنے لائے اور آپ نے دیکھا کہ اس کا چہرہ زرد ہے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں تو آپ کو اس پر بھی رحم آ گیا اور اپنے دونوں فرزندوں امام حسنؑ و امام حسینؑ کو ہدایت فرمائی کہ یہ تمہارا قیدی ہے اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنا، جو کچھ خود کھانا وہ اسے کھلانا، اگر میں اچھا ہو گیا تو مجھے اختیار ہے میں چاہوں گا تو سزا دوں گا اور چاہوں گا تو معاف کر دوں گا اور اگر میں دنیا میں نہ رہا اور تم نے اس سے انتقام لینا چاہا تو اسے ایک ہی ضربت لگانا، کیونکہ اس نے مجھے ایک ہی ضربت لگائی ہے، اور ہرگز اس کے ہاتھ پاؤں وغیرہ قطع نہ کیے جائیں،

اس لیے کہ یہ تعلیم اسلام کے خلاف ہے۔ دو روز تک علیؑ بستر بیماری پر انتہائی کرب اور تکلیف کے ساتھ رہے۔ آخر زہر کا اثر جسم میں پھیل گیا، اور ۲۱ ماہ رمضان کو نماز صبح کے وقت آپ کی وفات ہو گئی، حسنؑ و حسینؑ نے تجہیز و تکفین کی اور پشت کوفہ پر نجف کی سرزمین میں وہ انسانیت کا تاجدار ہمیشہ کے لیے آرام کی نیند سونے کے واسطے دفن ہو گیا۔

# حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

**نام و نسب** نام فاطمہ مشہور تھا، لقب زہرا اور کنیت "ام ابیہا" تھی۔ آپ حضرت خدیجہ بنت خویلد کے بطن سے پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی فرد فرید بیٹی تھیں جن کی نسل پاک سے باپ کے نام اور کام کی بقا رہی اور شاید اسی مناسبت سے آپ کی وہ کنیت ہوی جس کے معنی ہوتے ہیں اپنے باپ کی ماں یعنی وہ خاتون جو اپنے باپ کی زندگی کو پروان چڑھانے کا سبب ہو۔

**ولادت** یوں تو فرقہ وارانہ اختلافات کے ساتھ بہت سی تاریخی حقیقتیں ایسی ہیں جو مرکز اختلاف بن گئی ہیں، خصوصاً ولادت اور وفات کی تاریخوں کے بارے میں تو خود ایک فرقہ کے روایات میں بھی اکثر اختلاف ہوتا ہے مگر عموماً یہ اختلاف چند مہینوں یا دو ایک برس سے آگے نہیں بڑھتا لیکن حضرت سیدہ عالم کی تاریخ ولادت کے بارے میں فرق اسلامیہ میں جو اختلاف ہے وہ زاویے ہیں جس کے نتیجہ میں نو دس برس کی طولانی مدت کا فرق پیدا کر دیتا ہے اس لیے کہ مورخین اہل سنت کی اکثریت کا قول یہ ہے کہ آپ کی ولادت بعثت سے پانچ برس پہلے ہوی تھی اور فرقہ شیعہ کے روایات یہ ہیں کہ آپ بعثت سے پانچ برس بعد پیدا ہوی تھیں۔ ان روایات کی

بنیاد اہل بیت معصومین کی ارشادات پر ہے۔ مذہبی طور پران کے راویوں کے مستند ہونے کے علاوہ غالباً ہر غیر جانب دار محقق تاریخی نقطۂ نگاہ سے بھی اس سے اتفاق کرے گا کہ کسی شخصیت اور بالخصوص پردہ نشین خاتون کے متعلق اُس کے گھرانے والوں بلکہ اولاد کا بیان جتنا معتبر ہو سکتا ہے اُتنا کسی غیر کا بیان معتبر نہیں ہو سکتا۔ ان بیانات کی بنا پر صحیح قول یہی قرار پاتا ہے کہ حضرت سیدۂ عالم ۲۰ جمادی الثانی کو بعثت کے پانچویں سال یعنی ہجرت کے آٹھ برس قبل پیدا ہوئیں۔

**تربیت** رسولؐ کی بعثت کے دسویں برس خدیجۂ کبریٰ نے دنیا سے مفارقت کی، اُس وقت سیدۂ عالم صرف پانچ سال کی تھیں۔ اتنی مختصر عمر میں ماں کی آغوشِ شفقت سے جدائی کے بعد آپ کا گہوارۂ تربیت صرف باپ کا سایۂ رحمت تھا، اور پیغمبر اسلامؐ کی اخلاقی تربیت کا آفتاب تھا جس کی شعاعیں براہ راست اس بے نظیر گوہر کی آب و تاب میں اضافہ کر رہی تھیں۔ عورتوں میں اگر کسی کی صحبت اس عمر میں جناب سیدہ کو حاصل ہو سکتی تھی تو وہ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی مادرہ فاطمہ بنت اسد ہو سکتی ہیں یا آپ کی بہنیں اُم ہانی وغیرہ یا پھوپھی صفیہ بنت عبدالمطلب۔ یہ تمام بزرگ خواتین تھیں جو سیدۂ عالم کی شمعِ عصمت کا پروانہ بنی رہتی ہوں گی اور اسی ماحول میں سیدہ کا بچپنا اپنی منزلیں طے کر رہا تھا۔

**غم خواری** سیدہؑ کا بچپن اپنے والد بزرگوار کو اُس ناگوار ماحول میں

دیکھئے گزرا جو پیام تو حید پہونچانے اور پھر حضرت ابو طالب اور جناب خدیجہ کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد در پیش تھا۔ سیدہ اکثر اپنے باپ کے سر مبارک پر اشاعت حق کے جرم میں کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا سنتیں اور ان کے جسم کو پتھروں سے لہو لہان دیکھتی تھیں اور ان منصوبوں کا چرچا ان کے کانوں تک پہونچتا تھا، جو ان کے والد بزرگوار کے مشن بلکہ ان کی زندگی کو بھی ختم کرنے کے لیے قائم کیے جاتے تھے، مگر اس کم سنی کے عالم میں بھی سیدۂ عالم نہ ڈریں نہ سہمیں نہ گھبرائیں بلکہ اس ننھی سی عمر میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی مددگار رہیں

**ہجرت** سیدۂ عالم" کی آٹھ برس کی عمر تھی، جب کافروں نے ایکا کرکے ایک شب رسول کو قتل کرنے کا ارادہ کر کے آپ کے گھر کو گھیر لیا۔ آپ کو قدرت کی طرف سے اسکی اطلاع پہلے ہو گئی تھی، اس لیے آپ اپنے چچا زاد بھائی حضرت علی بن ابی طالبؑ کو اپنے بستر پر سونے کا حکم دے کر خود مخفی طریقہ پر مکۂ معظمہ سے مدینۂ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے تھے۔ حضرت علیؑ بستر رسولؐ پر تھے اور گھر کان کے اندر حضرت علی بن ابی طالبؑ کی والدہ فاطمہ بنت اسد کے ساتھ سیدۂ عالم فاطمہ زہراؑ بھی تھیں۔ اس وقت آپ کی عمر آٹھ سال تھی، اور یہ یقیناً آپ کی زندگی کا بڑا امتحان تھا اپنے گھر کے گرد خون کے پیاسے دشمنوں اور ان کی کھنچی ہوئی تلواروں کا گھیرا تھا۔ جس سے گھر میں رہ جانے والے سب ہی افراد پر ظاہری اسباب کے لحاظ سے دہشت پیدا ہونا چاہیے

اور اُدھر باپ کی جدائی کا صدمہ اور اُن کی جان کی حفاظت کا خیال، مگر سیّدہ نے اسی کم سنی میں اس مرحلہ کو صبر و استقلال سے طے کیا، پھر صبح کو جب دشمنوں نے دیکھا کہ رسولؐ چلے گئے ہیں، اور اُن کی جگہ پر علیؑ ہیں تو وہ سب گھر کو چھوڑ کر رسولؐ کی تلاش میں چلے گئے، اس وقت مکان کے رہنے والوں سے وقتی طور پر خطرہ دور ہو گیا، مگر رسولؐ کے متعلق ان کی فکر بڑھ گئی ہو گی۔ پھر چند روز کے بعد علی ابن ابی طالبؑ کا تنِ تنہا ان خواتین کو محملوں میں سوار کر کے اپنے ساتھ لینا اور مکہ سے نکل کر مدینہ کی طرف روانہ ہونا اور راستے میں مشرکین کا آ کر سدِّ راہ ہونا اور علیؑ کا تلوار کھینچنا، یہ سب عورتوں اور بچوں کے لیے کچھ کم دہشت ناک حالات نہ تھے، جن سے گزر کر سیدۂ عالم اپنے والد بزرگوار کے پاس مدینہ منورہ پہنچ گئیں۔

**شادی**

مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد ایک سال کے اندر فاطمہ زہراؑ کی عمر نو برس کی ہو گئی۔ شریعت اسلام میں یہ سن لڑکی کے بلوغ کا قرار دیا گیا ہے، اور تاکید ہے کہ اس کے بعد شادی میں دیر نہ کی جائے۔ اصحابِ رسولؐ میں بہت سے افراد رسولؐ کی طرف دامادی کی نسبت حاصل کرنے کے شرف کی تمنا رکھتے تھے مگر اس کے پہلے صاحبزادی کی کم سنی کا عذر اس سوال میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے کافی تھا۔ اب جب کہ ابتدائی عمر شادی کی آ گئی تو مجسّمِ خلقِ عظیم رسولؐ کی بارگاہ میں ہر ایک عرضِ تمنا کے لیے آنے لگا۔ مگر رسولؐ کی طرف سے کوئی ہمت افزا

جواب نہ ملا۔ خدا و رسولؐ کے نزدیک فاطمہ زہراؑ کے ساتھ شادی کے لیے صرف ایک فرد موزوں تھی" جواب تک خاموش تھی۔ یہ علیؑ کی ذات تھی، جنھوں نے رسولؐ کی گود میں بچپن سے پرورش پائی تھی، اور جس طرح فاطمہؑ اپنے طبقہ میں آپ کی اخلاقی تعلیم کا بہترین مرقع تھیں، اسی طرح علیؑ مردوں میں آپ کے تعلیمات کا مجسمہ تھے۔ علیؑ کے لیے فاطمہؑ اور فاطمہؑ کے لیے علیؑ کے سوا برابر کا کوئی دوسرا ہو ہی نہ سکتا تھا، مگر علیؑ رسولؐ سے خواستگاری کرتے ہوئے حجاب محسوس کرتے تھے، اور رسولؐ کو خود سے اس بارے میں کسی ارشاد کا کوئی موقع ہی نہ تھا جب ہر ایک اظہار تمنا کرنے والے کی خواہش ٹھکرا دی گئی تو انھی میں سے کچھ نے حضرت علی بن ابی طالبؑ سے تحریک کی کہ آپ بھی رسولؐ کی خدمت میں جا کر فاطمہؑ کی خواستگاری کریں۔ آخر علیؑ رسول کی بارگاہ میں آئے جھکی ہوئی نظروں کے ساتھ عرض تمنا کی۔ رسولؐ نے بشاش چہرہ کے ساتھ فرمایا کہ "تمھارے پاس مال دنیا سے کچھ ہے؟" عرض کیا، "بس گھوڑا، تلوار اور زرہ" فرمایا "گھوڑا اور تلوار تمھارے ایسے مجاہد کے لیے ضروری ہے مگر زرہ نامناسب، اس کو فروخت کر ڈالو"۔ عام مورخین کی روایت کے مطابق یہ زرہ ۵۰۰ درہم کو فروخت ہوئی، اسی رقم کو آپ نے بطور مہر سیدۂ عالم رسولؐ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ اسی سے رسولؐ نے فاطمہؑ کی شادی کا سامان کیا اور بیٹی کے لیے نظام خانہ داری میں، جس اسباب کی ضرورت تھی نہ خرید فرمایا، وہ کیا تھا، ایک چمڑے کا تکیہ

کھجور کی چھال سے بھرا ہوا، ایک بچھونا کھال کا، اور کچھ مٹی کے برتن، ایک مشکیزہ اور ایک چرخہ۔ ان مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ مہر فاطمہ زہراؑ کا جو حضرت علی بن ابی طالبؑ نے ادا کیا۔ وہ جس پر حضرت فاطمہ زہراؑ کا نکاح پڑھا گیا، چار سو مثقال چاندی تھا۔ تقریباً یہی مقدار پانچ سو درہم "مہر سنت" قرار پائی ہے۔ جس کی مقدار ایک سو سترہ تولہ چاندی ہوتی ہے، مگر مہر سنت کا مطلب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہونا فضیلت کے خلاف ہے۔ اتنا ہی ہو اور یا اس سے کم ہو اور اسی لیے فرقہ شیعہ کے معتبر ترین جوامع حدیث یعنی کتب اربعہ کے بعض احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کا مہر ظاہری طور پر اس عام مہر سے بھی جو مہر سنت قرار دیا گیا ہے، بہت کم یعنی صرف تیس درہم قرار دیا گیا تھا اگرچہ خالق کی طرف سے حضرت سیدۂ عالم کی روحانی عظمت کے لحاظ سے مہر سیدہ میں خدا کی خدائی کا بہت بڑا حصہ تھا مگر سیدہ کے مہر کو ظاہری حیثیت سے بہت کم رکھ کر ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کی اس ذہنیت کو تبدیل کرنے کا سامان کیا گیا کہ وہ مہر کی رقم کے خواہ مخواہ زیادہ ہونے کو معیار عزت نہ سمجھ لیں بلکہ یہ سمجھیں کہ مہر کا کم ہونا سیدۂ عالم کی پیروی ہونے کے لحاظ سے بہت بڑی عزت کا سرمایہ ہے۔ آخر کو اسلامی تاریخ میں ایک مثالی تقریب کے طور پر یہ شادی عمل میں آئی، اور اگر مسلمان اس شادی کی کیفیت کو پیش نظر رکھیں تو کبھی بے جا رسوم سے اپنی بربادی کی صورتیں اختیار

کرنے میں عزت محسوس نہ کریں۔

شادی ہونے کے بعد حضرت فاطمہ زہراؑ صرف نو برس زندہ رہیں

**اولاد** اس نو برس میں آپ کے یہاں شادی کے دوسرے ہی سال حضرت امام حسنؑ پیدا ہوئے، تیسرے سال حضرت امام حسینؑ پھر غالباً پانچویں سال حضرت زینبؑ اور ساتویں سال حضرت اُمّ کلثومؑ۔ نویں سال محسنؑ بطن میں تھے جب کہ وفاتِ رسولؐ ہوئی اور وہ ناگوار مصائب پیش آئے جن کے سبب سے اسقاط ہو گیا اور پھر حضرت سیدہ بھی جانبر نہ ہو سکیں۔ وفات کے وقت دو صاحبزادے حسنؑ اور حسینؑ موجود تھے جو امام خلق ہوئے اور دو صاحبزادیاں زینبؑ و اُمّ کلثومؑ تھیں، جو اپنے اوصاف کے لحاظ سے طبقۂ خواتین میں اپنی ماں کی سچی جانشین ثابت ہوئیں۔

سیدۂ عالم شکل و شمائل، گفتار و رفتار اور

**اخلاق و اوصاف** حسنِ بیان ہر بات میں رسولؐ سے انتہائی مشابہ اور خصوصیت کے ساتھ سچائی اور امانت داری میں اپنے والد بزرگوار کی مکمل تصویر تھیں۔ آپ نے اپنی مختصر زندگی میں نسوانی زندگی کے ہر شعبہ میں اپنی بلند سیرت کے وہ نمایاں نقوش چھوڑے ہیں جو ہمیشہ ہمیشہ اس طبقہ کی رہنمائی کے لیے کافی ہیں۔

فاطمہ زہراؑ نے شادی کے بعد سے تمام گھر کا کام اپنے

**خانہ داری** ہاتھ سے کرنا شروع کیا، جھاڑو دینا، کھانا پکانا

چرخہ چلانا، چکی پیسنا اور بچوں کی تربیت کرنا، یہ سب کام وہ اکیلی اکیلی سیدہ ہی کرتی تھیں لیکن نہ کبھی تیوریوں پر بل آئے نہ اپنے شوہر حضرت علی بن ابی طالبؑ سے کبھی اپنے لیے کسی مددگار یا خادمہ کے انتظام کی فرمائش کی۔ ایک مرتبہ اپنے پدر بزرگوار حضرت رسول خداؐ سے ایک کنیز عطا کرنے کی خواہش کی تو رسولؐ نے بجائے کنیز عطا فرمانے کے وہ تسبیح تعلیم فرمائی جو تسبیح فاطمہ زہراؑ کے نام سے مشہور ہے، ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر، ۳۳ مرتبہ الحمد للہ، اور ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ، حضرت فاطمہؑ اس تسبیح کی تعلیم سے اتنی خوش ہوئیں کہ کنیز کی خواہش ترک کر دی۔ بعد میں رسولؐ نے بلا طلب ایک کنیز عطا فرمائی، جو فضہ کے نام سے مشہور ہے سیدہ فضہ کے ساتھ ایک کنیز کا سا نہیں بلکہ برابر سے ایک عزیز دوست کا سا برتاؤ کرتی تھیں۔ اسلام کی تعلیم یقیناً یہ ہے کہ مرد اور عورت دونوں زندگی کے جہاد میں مشترک طور پر حصہ لیں اور کام کریں، بیکار نہ بیٹھیں، مگر ان دونوں میں صنف کے اختلاف کے لحاظ سے تقسیم عمل ہے اس تقسیم کار کو علیؑ اور فاطمہؑ نے مکمل طریقہ پر دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ گھر سے باہر کے تمام کام آب کشی کرنا، باغوں میں پانی دینا، اور اپنی قوت بازو سے اپنے اور اپنے گھر والوں کی بسر زندگی کا سامان کرنا یہ علیؑ کے ذمہ تھے اور گھر کے اندر کے تمام کام حضرت فاطمہ زہراؑ انجام دیتی تھیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آج چودہ سو برس کے بعد بھی کاموں کی شکل وہی رہے جو پہلے تھی بلکہ زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے ان میں فرق

ہو سکتا ہے مگر اس روح کو جو گھر کے اندر اور باہر کی زندگی کے تفرقے کے ساتھ قائم ہے، محفوظ رکھا جانا ہر حال میں ضروری ہے۔

**ترک و احتشام اور آرائش سے علیحدگی** عام طور سے خواتین کی طبیعت اسباب زیب و زینت کی طرف خاص رغبت رکھتی ہے۔ اس کے سبب سے اکثر مردوں کو پریشانی اٹھانا پڑتی ہے اور بسا اوقات آمد و خرچ کے توازن میں فرق کی ذمہ داری آرائش پسندی ہوتی ہے جس سے اقتصادی تباہی آتی ہے۔ سیدۂ عالم نے ہمیشہ اپنی زندگی کو مسلمانوں کے غریب گھرانوں کی عورتوں کے لیے ایک بہترین نمونہ کی حیثیت سے پیش کیا اور کبھی لباس و زیور یا سامان خانہ داری میں تصنع اور تجمل کو پسند نہیں کیا، اور خود رسولؐ کی تعلیم بھی یہی رہی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ ایک مرتبہ سیدۂ عالمؑ نے اپنے لیے دو چاندی کے کنگن، گلوبند، اور دو گوشوارے اور دروازہ کا نیا پردہ تیار کرا لیا تھا، اور پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ و آلہ تشریف لائے تو آپ کی صرف ایک معنی خیز خاموشی سے سیدہ کو بہتر یہ معلوم ہوا کہ اسے راہ خدا میں خیرات کر دیں۔

رسالتمآبؐ کو یہ معلوم ہوا تو اتنا خوش ہوئے کہ تین مرتبہ فرمایا وہی کیا جو میں چاہتا تھا، اس کا باپ اس پر فدا ہو جائے یہ اس معلم انسانیت عظیم ترین باپ کی بلند مرتبہ بیٹی ہی صرف وہ تھی جو اس کے بلند اخلاقی معیار تعلیم کو عمل کی مجسم شکل میں اس نقطہ پر لا سکے جو اس کا

معراج بلندی کا ہے۔

## فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کی عبادت و دعا کے موقع پر ایثار کی

عبادت وہ تھی جو عالم انسانیت کے اس طبقہ کے لیے جاودانی مثال ہے۔ عبادت بظاہر مخلوق اور خالق کے درمیان کی انفرادی چیز ہے اس لیے زیادہ تر عبادت کرنے والے ایسے ہوں گے جو شاید اپنے مال بلکہ غذا میں بھی دوسروں کو اپنے اوپر مقدم کر سکتے ہوں مگر اللہ کی بارگاہ میں تو "خود غرضی" ہی نظر آتی ہے، لیکن آل رسول اس سے مستثنےٰ ہیں وہ خالق کی بارگاہ میں بھی کھڑے ہوتے تھے تو دوسرے مخلوق کا درد اپنے دل میں لیے ہوئے چنانچہ حضرت سیدۂ عالم کے متعلق شاہزادہ امام حسنؑ کا بیان ہے کہ سیدۂ عالم نے رات بھر محراب عبادت میں کھڑے ہوکر نماز پڑھی اور مومنین و مومنات کے لیے بہت دعائیں مگر اپنے لیے کوئی دعا نہ مانگی۔ اس کے بعد میں شاہزادہ نے آپ سے ذکر کیا تو فرمایا کہ الجار ثم الدار، یہ عربی کی کہاوت ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ پڑوسی کا خیال گھر کی دیکھ بھال سے مقدم ہے۔

سیدۂ عالم نہ صرف اپنی سیرت زندگی بلکہ اقوال سے بھی خواتین پردہ داری کے لیے پردہ کی اہمیت پر بہت زور دیتی تھیں۔ آپ کا مکان مسجد رسولؐ سے بالکل متصل تھا لیکن آپ برقع و چادر میں نہاں ہوکر بھی اپنے والد بزرگوار کے پیچھے نماز جماعت میں شرکت یا آپ کے وعظ کے سننے کے لیے مسجد میں تشریف نہیں لائیں بلکہ اپنے فرزند امام حسنؑ سے

جب وہ مسجد سے واپس جاتے تھے، اکثر رسولؐ کے خطبہ کے مضامین سُن لیا کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ پیغمبرؐ نے منبر پر یہ سوال پیش کر دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر کیا چیز ہے؟ یہ بات سیدہؑ تک پہونچی تو آپ نے جواب دیا کہ عورت کے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ نہ اُس کی نظر کسی غیر مرد پر پڑے اور نہ کسی غیر مرد کی نظر اُس پر پڑے۔ رسولؐ کے سامنے یہ جواب پیش ہوا تو حضرتؐ نے فرمایا "کیوں نہ ہو، فاطمہؑ میرا ہی ایک جزو ہے"!

**خدمتِ اسلام** } اسلامی تعلیم میں عورت کے جہاد کی نوعیت ہی مرد کے جہاد سے الگ رکھی گئی ہے لہٰذا حضرت فاطمہ زہراؑ بھی اسی کی پابند تھیں اس لیے کسی جہاد میں سیدہؑ عالمؑ کا میدانِ جنگ میں قدم رکھنا ثابت نہیں ہوتا، لیکن جس حد تک اُن کے حدود عمل تھے ان میں ان جہادوں کے ذیل میں بھی غیر متعلق نہ تھیں مثلاً جنگ اُحد میں جب پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ مدینہ واپس آئے اس حالت میں کہ چہرہ خون سے رنگین تھا تو سیدہؑ عالم ہی تھیں جو ظرف میں پانی لے کر حاضر ہوئیں اور رسولؐ کا چہرہ دُھلوایا علی بن ابی طالبؑ آئے اس شان سے کہ شانوں تک دونوں ہاتھ دشمنوں کے خون سے رنگین تھے اور تلوار سے خون ٹپک رہا تھا، آپ نے تلوار فاطمہ زہراؑ کی طرف بڑھائی اور عجیب فخر کے انداز میں

---

لہ ارشاد شیخ مفید

کہا کہ لو یہ تلوار آج اس نے میرے ساتھ وفاداری کی حد کر دی۔ رسولؐ نے ارشاد کیا کہ لو فاطمہؑ علیؑ کے ہاتھ سے تلوار کو لو۔ آج تمہارے شوہر نے جو اُن کا فرض تھا وہ بڑے نازک مرحلہ پر ادا کیا اور اللہ نے انھی کی تلوار سے قریش کے بڑے بڑے آدمیوں کا خاتمہ کرایا۔ فاطمہ زہراؑ نے خاموشی کے ساتھ ان باتوں کو سنا، تلوار ہاتھ میں لی، اور یقیناً ان باتوں سے اُنھوں نے خود بھی ایک طرح کا فخر محسوس کیا جس کے ساتھ اُنھیں ایسی عظیم منزل جہاد میں بذات خود شریک ہونے کا کوئی افسوس بھی نہ تھا اس لیے کہ وہ سمجھتی تھیں کہ اُن کا جہاد یہی ہے جسے وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں رہ کے اسی طرح پورے طور پر ہمیشہ ادا کیا کرتی ہیں، جس طرح علیؑ نے ان جنگوں میں جہاد کا فرض ادا کیا۔ ہاں صرف ایک موقع عیسائیوں کے مقابلہ میں پُرامن روحانی جہاد یعنی مباہلہ کا ایسا تھا، جہاں سیدۂ عالمؑ خدا کے حکم سے بُرقع و چادر میں نہاں ہو کر اپنے باپ اور شوہر کے ساتھ گھر سے باہر نکلیں جس کا واقعہ یہ تھا کہ یمن سے عیسائیوں کے علماء کا ایک وفد رسولؐ کے پاس بحث و مباحثہ کے لیے آیا اور کئی دن اُن سے بحث ہوتی رہی جس سے حقیقت اُن پر روشن تو ہو گئی مگر سخن پروری کی بنا پر وہ قائل نہ ہونا تھے نہ ہوئے اس وقت قرآن کی آیت اُتری کہ اے رسولؐ اتنے سچے دلائل کے بعد بھی یہ نہیں مانتے تو ان سے کہو کہ پھر آجاؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹوں کو، ہم اپنی عورتوں کو بلائیں تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنے نفسوں کو بلائیں تم اپنے نفسوں کو اور

اللہ کی طرف رجوع کریں اور جھوٹوں کے لیے اللہ کی لعنت یعنی عذاب کی بددعا کریں"، عیسائی علماء پہلے تو اس کے لیے تیار ہو گئے مگر جب رسول اللہ تشریف لے گئے اس شان سے کہ حسنؑ اور حسینؑ ایسے بیٹے، فاطمہ زہراؑ ایسی خاتون اور علیؑ ایسے نفس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے تھے تو عیسائیوں نے مباہلہ سے انکار کر دیا اور مخصوص شرائط پر صلح کر کے واپس گئے، اس طرح فاطمہ زہراؑ نے ثابت کر دیا کہ اُن کا معیار پردہ بھی جس کی وہ پابند ہیں بربنائے عادت نہیں بلکہ بربنائے فرض ہے، اس لیے کسی مستثنےٰ صورت میں اللہ کا حکم ظاہری صورت میں اُن کے عام دستور زندگی کے خلاف فریضہ عائد کرے تو اس کی تعمیل بھی اُن کے لیے ویسی ہی خوشگوار ہے جیسی اپنے عام دستور کی پابندی۔

**رسولؐ کا برتاؤ** حضرت فاطمہ زہراؑ کے اوصاف وکمالات ہی کا نتیجہ تھا کہ رسولؐ فاطمہ زہراؑ کے ساتھ محبت بھی انتہائی فرماتے تھے اور آپ کی عزت بھی ایسی کرتے تھے جیسی اپنی بیٹی کی عزت کوئی دوسرا باپ نہیں کیا کرتا

محبت کے مظاہروں میں سے ایک یہ تھا کہ جب آپ کسی غزوہ پر تشریف لے جاتے تھے تو سب سے آخر میں فاطمہ زہراؑ سے رخصت ہونے تشریف لاتے تھے اور جب واپس آتے تھے تو سب سے پہلے فاطمہ زہراؑ کے دیکھنے کو تشریف لاتے تھے۔

اور عزت واحترام کا مظاہرہ یہ ہے کہ جب فاطمہؑ آتی تھیں تو آپ

تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے، اور اپنی جگہ پر لا کر بٹھاتے تھے۔ یہ برتاؤ رسولؐ کا فاطمہ زہراؑ کے سوا کسی دوسرے شخص کے ساتھ نہ تھا۔

**فضائل** سیدۂ عالم کی فضیلت میں پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتنی حدیثیں وارد ہیں جتنی حضرت علی بن ابی طالبؑ کے سوا کسی دوسری شخصیت کے لیے نہیں ملتیں۔ ان میں سے اکثر علمائے اسلام میں متفقہ حیثیت رکھتی ہیں، مثلاً آپؑ بہشت میں جانے والی عورتوں کی سردار ہیں" "ایمان لانے والی عورتوں کی سردار ہیں" "تمام جہاں کی عورتوں کی سردار ہیں" "آپ کی رضا سے اللہ راضی ہوتا ہے اور آپ کی ناراضگی سے اللہ ناراض ہوتا ہے" "جس نے آپ کو ایذا دی اُس نے رسولؐ کو ایذا دی، آپ کا نام فاطمہؑ اس لیے ہوا ہے کہ خدا نے آپ کی بدولت آپ کے دوست رکھنے والوں کو عذاب جہنم سے چھڑا دیا ہے" "فطم" کے معنی چھڑانے کے ہیں۔ فاطمہؑ کے معنی ہوئے "چھڑانے والی" اس طرح کی بکثرت حدیثیں ہیں جو معتبر کتابوں میں درج ہیں

**وفاتِ رسولؐ** بعثت کے ۲۳ برس اور ہجرت کے دس برس بعد جب فاطمہ زہراؑ ۱۸ برس کی تھیں آپ کے شفیق اور عزت کرنے والے قدردان باپ نے دنیا سے رحلت فرمائی، اس صدمہ کا اثر فاطمہ زہراؑ نے اتنا لیا جتنا کسی بیٹی نے کبھی اپنے باپ کی وفات کا اثر نہیں لیا ہے

**نوحہ بکا** رسولؐ کی وفات کے بعد سیدۂ عالمؑ جتنے دن زندہ رہیں،

کبھی کسی نے آپ کو ہنستے یا مسکراتے نہیں دیکھا بلکہ برابر باپ کے غم میں روتی رہیں، اور آپ اتنے پُر درد طریقہ پر نوحہ کرتی تھیں کہ آس پاس کے رہنے والے بھی شدید طور پر متاثر ہوتے تھے۔

**ناگوار حالات** } افسوس ہے کہ وہ فاطمہؑ جن کی تعظیم کو رسولؐ کھڑے ہو جاتے تھے، بعد رسولؐ اہلِ زمانہ کا رُخ اپنی طرف سے پھرا ہوا محسوس کرتی تھیں۔ علی بن ابی طالبؑ سے خلافت کا ہٹایا جانا ہی سیدہؑ کے لیے کیا کم تھا کہ آپؑ سے بیعت کا سوال بھی کیا جانے لگا، اور صرف سوال ہی نہیں، بلکہ جبر و تشدد سے کام لیا جانے لگا انتہا ہے کہ سیدۂ عالمؑ کے گھر پر لکڑیاں جمع کر دی گئیں اور آگ لگائی جانے لگی، اس وقت کے صدمہ و زحمت کی شدت وہ تھی جسے جسمانی حیثیت سے سیدہؑ برداشت نہ کر سکیں اور وہی آپ کی وفات کا سبب ہوا، ان صدموں کی شدت سیدہؑ کی زبان پر جاری ہونے والے اس شعر سے ظاہر ہے کہ:۔

صبّت علیّ مصائبٌ لو انّہا ۔۔۔ صُبّت علی الایام صرن لیالیا

مجھ پر وہ مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر وہ دنوں پر پڑتیں تو وہ رات ہو جاتے

**فدک** } سیدہؑ کو جو جسمانی و روحانی صدمے پہونچے اُن میں ایک بڑا اضافہ اس سے ہو گیا کہ فدک جائداد جو رسولؐ نے سیدۂ عالمؑ کو مرحمت فرمائی تھی، اُسے بعد رسولؐ ضبط کر لیا گیا۔ جائداد کا چلا جانا سیدہؑ کے لیے اتنی تکلیف کا باعث نہ ہو سکتا تھا جتنا کہ آپ کے

دعوے کو حکومت کی طرف سے غلط قرار دیا جانا۔ یہ وہ صدمہ تھا جس کا اثر سیدہؑ کے دل پر مرتے دم تک رہا۔

**وصیتیں** حضرت فاطمہ زہراؑ نے طبقہ خواتین کے لئے پردہ کی یادگار اہمیت اس وقت بھی قائم کی جب آپ دنیا سے رخصت ہونے والی تھیں اس طرح کہ آپ ایک دن غیر معمولی طور پر فکر مند نظر آئیں آپ کی چچی (جعفر طیار کی بیوہ) اسما بنت عمیس نے سبب دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ مجھے جنازہ کے اٹھانے کا یہ دستور اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ عورت کی میت کو بھی تختہ پر اٹھایا جاتا ہے جس سے اس کا قد و قامت نظر آتا ہے۔ اسما نے کہا میں نے ملک حبشہ میں ایک طریقہ جنازہ اٹھانے کا دیکھا ہے وہ غالباً آپ کو پسند ہوگا۔ اس کے بعد انھوں نے تابوت کی ایک شکل بنا کر دکھائی اس پر سیدہ عالم بہت خوش ہوئیں اور پیغمبرؐ کے بعد صرف یہ ایک موقع ایسا تھا کہ آپ کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی چنانچہ آپ نے وصیت فرمائی کہ آپ کو اسی طرح کے تابوت میں اٹھایا جائے۔ مورخین تصریح کرتے ہیں کہ سب سے پہلی لاش جو تابوت میں اٹھی ہے وہ حضرت فاطمہ زہراؑ کی تھی اس کے علاوہ آپ نے یہ وصیت بھی فرمائی تھی کہ آپ کا جنازہ پردہ شب میں اٹھایا جائے اور ان لوگوں کو اطلاع نہ دی جائے جن کے طرز عمل نے آپ کے دل میں زخم ڈال دیئے تھے اور جن سے انتہائی ناراضگی کے عالم میں آپ دنیا سے رخصت ہوئیں۔

**وفات** ۔ آخر سیدۂ عالم نے اپنے والد بزرگوار رسول خداؐ کی وفات کے ۳ مہینہ بعد تیسری جمادی الثانی ۱۱ھ میں وفات پائی۔ آپ کی وصیت کے مطابق آپ کا جنازہ رات کو اٹھایا گیا حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے تجہیز و تکفین کا انتظام کیا۔ صرف بنی ہاشم

اور سلمان اور مقداد و عمار ایسے چند مخلصین کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی اور خاموشی کے ساتھ دفن کر دیا آپ کے محل دفن کی اطلاع بھی عام طور سے لوگوں کو نہیں ہوئی جس کی بنا پر یہ اختلاف رہ گیا کہ آپ جنۃ البقیع میں دفن ہیں یا اپنے ہی مکان میں جو بعد کو مسجد رسول کا جزو بن گیا۔ جنۃ البقیع میں جو آپ کا روضہ تھا وہ بھی باقی نہیں رہا بلکہ ۸ر شوال ۱۳۴۴ھ کو ابن سعود نے دوسرے مقابر اہل بیتؑ کے ساتھ اسے بھی منہدم کر دیا۔

# ہمارے دوسرے امام

## حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السّلام

**نام ونسب** حسنؑ نام مجتبیٰ لقب اور ابو محمد کنیت تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معزز بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے بطن سے حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کے بڑے فرزند تھے۔

**ولادت** ۱۵ ار رمضان المبارک کو ہجرت کے تیسرے سال آپ کی ولادت ہوی۔ رسولؐ کے گھر میں آپ کی پیدائش اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی۔ جب مکہ معظمہ میں رسولؐ کے بیٹے یکے بعد دیگرے دنیا سے جاتے رہے اور سوائے لڑکی کے آپ کی اولاد میں کوئی نہ رہا تو مشرکین طعنے دینے لگے اور آپ کو معاذاللہ ابتر یعنی مقطوع النسل کہنے لگے اس سے آپ کو بڑا صدمہ پہنچا اور آپ کی تسلی کے لئے قرآن مجید میں سورۂ کوثر نازل ہوا جس میں آپ کو خوش خبری دی گئی کہ خدانے آپ کو کثرت اولاد عطا فرمائی ہے اور مقطوع النسل آپ نہیں بلکہ آپ کا دشمن ہوگا۔

حضرت امام حسن علیہ السّلام کی مدینہ میں آنے کے تیسرے ہی سال پیدائش گویا سورہ کوثر کی پہلی تفسیر تھی۔ دنیا جانتی ہے کہ انھی امام حسنؑ اور ان کے چھوٹے

بھائی امام حسین علیہ السلام کے ذریعے سے اولاد رسولؐ کی وہ کثرت ہوئی کہ باوجود ان کوششوں کے جو دشمنوں کی طرف سے اس خاندان کے ختم کرنے کی ہمیشہ ہوتی رہیں جن میں ہزاروں کو سولی دے دی گئی ہزاروں تلوار سے قتل کیے گئے اور کتنوں کو زہر دیا گیا۔ اس کے باوجود آج تک دنیا آل رسولؐ کی نسل سے چھلک رہی ہے عالم کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا ہوگا جہاں اس خاندان کے افراد موجود نہ ہوں جبکہ رسولؐ کے دشمن جن کی اس وقت کثرت سے اولاد موجود تھی ایسے فنا ہوئے کہ نام ونشان بھی ان کا کہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ہے قرآن کی سچائی اور رسولؐ کی صداقت کا زندہ ثبوت جو دنیا کی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ کے لیے موجود ہے اور اس لیے امام حسن علیہ السلام کی پیدائش سے پیغمبرؐ کو ویسی ہی خوشی نہیں ہوئی جیسی ایک نانا کو نواسے کی ولادت سے ہونا چاہیے بلکہ آپ کو خاص مسرت یہ ہوئی کہ آپ کی سچائی کی پہلی نشانی دنیا کے سامنے آئی۔ ساتویں دن عقیقہ کی رسم ادا ہوئی اور پیغمبرؐ نے بحکم خدا اپنے اس فرزند کا نام حسنؑ رکھا۔ یہ نام اسلام کے پہلے نہیں ہوا کرتا تھا یہ سب سے پہلے پیغمبرؐ کے اسی فرزند کا نام قرار پایا حسینؑ ان کے چھوٹے بھائی کا نام بھی بس انھی سے مخصوص تھا۔ ان کے پہلے کسی کا یہ نام نہ ہوا تھا۔

**تربیت** حضرت امام حسن علیہ السلام کو تقریباً آٹھ برس اپنے نانا رسول اللہؐ کے سایہ عاطفت میں رہنے کا موقع ملا رسالت مآبؐ اپنے اس نواسے سے جتنی محبت فرماتے تھے اس کے واقعات دیکھنے والوں نے ہمیشہ یاد رکھے۔ اکثر حدیثیں محبت اور فضیلت کی حسنؑ اور حسینؑ دونوں

صاحب زادوں میں مشترک ہیں مثلاً حسنؑ اور حسینؑ جوانان بہشت کے سردار ہیں۔ دونوں گوشوارۂ عرش ہیں، یہ دونوں میرے گلدستے ہیں، خداوندا میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان کو محبوب رکھنا اور اس طرح کے بے شمار ارشادات پیغمبرؐ کے دونوں نواسوں کے بارے میں کثرت سے ہیں ان کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ عام قاعدہ یہ ہے کہ اولاد کی نسبت باپ کی جانب ہوتی ہے مگر پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ان دونوں نواسوں کی یہ خصوصیت صراحت کے ساتھ بتائی کہ انھیں میرا نواسا ہی نہیں بلکہ میرا فرزند کہنا درست ہے۔

یہ حدیث حضرت کی تمام اسلامی حدیث کی کتابوں میں درج ہے حضرت نے فرمایا خدا نے ہر شخص کی اولاد کو خود اس کے صلب سے قرار دیا اور میری اولاد کو اس نے علیؑ ابن ابی طالب کی صلب سے قرار دیا پھر بھلا ان بچوں کی تربیت میں پیغمبرؐ کس قدر اہتمام صرف کرنا ضروری سمجھتے ہوں گے جبکہ خود بچے بھی وہ تھے جنھیں قدرت نے طہارت وعصمت کا لباس پہنا کر بھیجا تھا۔ ایک طرف آئینے اتنے صاف اس پر رسولؐ کے ہاتھ کی جلا، نتیجہ یہ تھا کہ بچے کم سنی ہی میں نانا کے اخلاق واوصاف کی تصویر بن گئے۔ خود حضرت نے ان کے بارے میں ارشاد فرمایا کہ حسنؑ میں میرا رعب وداب اور شان سرداری ہے اور حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے۔ شان سرداری گو مختصر لفظ ہے مگر اس میں بہت سے اوصاف وکمال کی جھلک نظر آرہی ہے اس کے ساتھ ساتھ مختلف صورتوں سے رسولؐ نے بحکم خدا اپنے مشن کے کام میں ان کو اسی

بچپن کے عالم میں شریک بھی کیا جس سے یہ ثابت بھی ہوا کہ پیغمبرؐ اپنے بعد تبلیغِ الٰہی حفاظتِ اسلام کی مہم کو اپنے ہی اہلِ بیتؑ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا ایک موقع مباہلہ کے میدان میں تھا حضرت امام حسنؑ بھی اپنے نانا کے ساتھ ساتھ تھے

۲۸ ربیع الاول سنہ ۱۱ھ کو جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ہو گئی اور امام حسن علیہ السلام اس مسرت اور اطمینان کی زندگی سے محروم ہو گئے نانا کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام حسنؑ کو اپنی مادرِ گرامی حضرت فاطمہ زہراؑ کی وفات کا صدمہ اٹھانا پڑا۔ اب حسنؑ کے لئے گہوارہ تربیت اپنے مقدس باپ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی ذات تھی حسنؑ اسی دور میں جوانی کی حدود تک پہونچے اور کمال شباب کی منزلوں کو طے کیا پچیس ۲۵ برس کی خانہ نشینی کے بعد جب حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو مسلمانوں نے خلیفہ ظاہری کی حیثیت سے تسلیم کیا اور اس کے بعد جمل صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں تو ہر ایک جہاد میں حسن علیہ السلام اپنے والد بزرگوار کے ساتھ ساتھ تھے بلکہ بعض موقعوں پر جنگ میں آپ نے کارنمایاں بھی دکھلائے۔

**خلافت** | ۲۱ ماہ رمضان سنہ ۴۰ھ میں حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی وفات ہوئی اس وقت تمام مسلمانوں نے مل کر حضرت امام حسن علیہ السلام کی خلافت تسلیم کی آپ پر اپنے والد بزرگوار کی شہادت کا بڑا اثر تھا سب سے پہلا خطبہ جو آپ نے ارشاد فرمایا اس میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے فضائل و مناقب تفصیل کے ساتھ بیان کئے۔ جناب امیرؑ کی سیرت اور دنیا سے بے مہری کا تذکرہ کیا اس وقت آپ پر گریہ کا اتنا غلبہ ہوا کہ گلے میں پھندا پڑ گیا اور تمام لوگ بھی رو

بے اختیار رونے لگے۔ پھر آپ نے اپنے ذاتی اور خاندانی فضائل بیان کیے عبداللہ ابن عباس نے کھڑے ہو کر تقریر کی اور لوگوں کو بیعت کی دعوت دی سب نے انتہائی خوشی اور رضامندی کے ساتھ بیعت کی آپ نے مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے اسی وقت لوگوں سے صاف صاف یہ شرط کر دی کہ "اگر میں صلح کروں تو تم کو صلح کرنا ہوگی اور اگر میں جنگ کروں تو تمھیں میرے ساتھ مل کر جنگ کرنا ہوگی" سب نے اس شرط کو قبول کر لیا آپ نے انتظام حکومت اپنے ہاتھ میں لیا۔ اطراف میں عمال مقرر کیے۔ حکام معین کیے اور مقدمات کے فیصلے کرنے لگے۔

یہ وقت وہ تھا کہ دمشق میں امیر شام معاویہ کا تخت سلطنت پر قبضہ مضبوط ہو چکا تھا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے ساتھ صفین میں جو لڑائیاں امیر شام کی ہوئی تھیں ان کا نتیجہ تحکیم کی ساز شانہ کارروائی کی بدولت امیر شام کے موافق نکل چکا تھا اور مرحضرت علی ابن ابی طالبؑ کی سلطنت کے اندر جہاں اب حضرت امام حسنؑ حکمران ہوئے تھے باہمی تفرقے اور بددلی پیدا ہو چکی تھی خود جناب امیرؑ کے احکام کی تعمیل میں جس طرح کوتاہیاں کی جاتی تھیں وہ حضرت کے آخر عمر کے خطبوں سے ظاہر ہے۔ خوارج نہروان کا فتنہ مستقل طور پر بے اطمینانی کا باعث بنا ہوا تھا جنکی اجتماعی طاقت کو اگرچہ نہروان میں شکست ہو گئی تھی مگر ان کے منتشر افراد اب بھی ملک کے امن وامان کو صدمہ پہنچانے پر تلے ہوئے تھے یہاں تک کہ بظاہر اسی جماعت کا ایک شخص تھا جس نے حضرت امیرؑ کے سر پر مسجد میں ضربت لگائی اور جس کے صدمہ سے آپ کی وفات ہوئی تھی۔

ابھی ملک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے غم میں سوگوار تھا اور حضرت امام حسنؑ پورے طور پر انتظامات بھی نہ کر چکے تھے کہ امیر شام کی طرف سے آپ کی مملکت میں دراندازی شروع ہو گئی اور ان کے خفیہ کارکنوں نے اپنی کارروائیاں جاری کر دیں چنانچہ ایک شخص قبیلہ حمیر کا کوفہ میں اور ایک شخص بنی قین میں سے بصرہ میں پکڑا گیا۔ یہ دونوں اس مقصد سے آئے تھے کہ یہاں کے حالات سے دمشق میں اطلاع دیں اور فضا کو امام حسن علیہ السلام کے خلاف ناخوشگوار بنائیں غنیمت ہے کہ اس کا انکشاف ہو گیا۔ حمیر والا آدمی کوفہ میں ایک قصائی کے گھر سے اور قین والا آدمی بصرہ میں بنی سلیم کے یہاں سے گرفتار کیا گیا اور دونوں کو جرم کی سزا دی گئی اس واقعہ کے بعد حضرت امام حسنؑ نے معاویہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون یہ تھا کہ تم اپنی دراندازیوں سے نہیں باز آتے، تم نے لوگ بھیجے ہیں کہ میرے ملک میں بغاوت پیدا کرائیں اور اپنے جاسوس یہاں پھیلا دیئے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ تم جنگ کے خواہش مند ہو ایسا ہو تو پھر تیار رہو، یہ منزل کچھ دور نہیں ہے، نیز مجھ کو خبر ملی ہے کہ تم نے میرے باپ کی وفات پر طعن و تشنیع کے الفاظ کہے۔ یہ ہرگز کسی ذی ہوش آدمی کا کام نہیں ہے موت سب کے لئے ہے۔ آج ہمیں اس حادثے سے دوچار ہونا پڑا تو کل تمھیں ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے مرنے والے کو مرنے والا سمجھتے نہیں۔ وہ تو ویسا ہے جیسے ایک منزل سے منتقل ہو کر اپنی دوسری منزل میں جا کر آرام کی نیند سو جائے"۔

اس خط کے بعد امیر شام اور امام حسنؑ کے درمیان بہت سے خطوط کی ردو بدل ہوئی۔ امیر شام کو اپنے جاسوسوں کے ذریعہ سے اہل کوفہ کے باہمی تفرقہ اور

بددلی اور عملی کمزوریوں کا علم ہو گیا۔ اس لئے وہ سمجھے کہ یہی موقع ہے کہ عراق پر حملہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اپنی فوجوں کو لے کر عراق کے حدود تک پہنچ گئے اس وقت حضرت امام حسنؑ نے بھی مقابلہ کی تیاری کی اور حجر بن عدی کو بھیجا کہ وہ دورہ کر کے اطراف ملک کے حکام کو مقابلے کے لئے آمادہ کریں اور لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کریں مگر جو خیال تھا وہی ہوا کہ عام طور پر سرد مہری سے کام لیا گیا تھوڑی فوج تیار ہوئی تو ان میں کچھ فرقہ خوارج کے لوگ تھے کچھ شورش پسند اور مال غنیمت کے طلب گار اور کچھ لوگ صرف اپنے سرداران قبائل کے دباؤ سے شریک تھے بہت کم وہ لوگ تھے جو واقعی حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے شیعہ سمجھے جا سکتے ہوں۔

اُدھر معاویہ نے عبداللہ ابن عامر ابن کریز کو آگے روانہ کیا اور اس نے مقام انبار میں جا کر چھاؤنی چھائی۔ اِدھر حضرت امام حسنؑ اس کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوئے اور مقام دیر کعب کے قریب ساباط میں قیام کیا۔ یہاں پہونچ کر آپ نے لوگوں کی حالت کا جائزہ لینے کے لئے سب کو جمع کر کے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس کا مضمون یہ تھا کہ دیکھو مجھے کسی مسلمان سے کینہ نہیں ہے میں تمہارا اتنا ہی خیر خواہ ہوں جتنا خود اپنی ذات کی نسبت مجھے ہونا چاہیئے۔ میں تمہارے بارے میں ایک فیصلہ کن رائے قائم کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ تم میری رائے سے انحراف نہ کرو گے میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں سے اکثر کی ہمت جہاد سے پست ہو گئی ہے اور میں کسی طرح یہ صحیح نہیں سمجھتا کہ تمہیں بادل ناخواستہ کسی مہم پر مجبور کر دوں۔ اس تقریر کا ختم ہونا تھا کہ مجمع میں ہنگامہ پیدا ہو گیا یقینی علیؑ ایسے بہادر باپ کا بہادر فرزند تنہا،

اس ہنگامہ آور جماعت کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ اگر یہ کھلم کھلا دشمنوں کی جماعت ہوتی۔ مگر اس کے پہلے خود حضرت علیؑ بھی اُس وقت بظاہر بے بس ہو گئے تھے جب نیزوں پر قرآن اونچے کئے جانے کے بعد صفین میں خود آپ کی فوج کے آدمی آپ کو گھیر کر کھڑے ہو گئے تھے کہ آپ جنگ کو روکئے نہیں تو ہم آپ کو قید کر کے دشمن کے سپرد کر دیں گے اس وقت جناب امیرؑ نے ایسا نہیں کیا کہ تلوار لے کر ان سے لڑنے لگتے بلکہ مجبوراً جنگ کو ملتوی فرمایا اس سے زیادہ سخت صورت سے اس وقت امام حسنؑ کو سامنا کرنا پڑا کہ مجمع نے آپ پر حملہ کر دیا اور مصلا قدم کے نیچے سے کھینچ لیا۔ چادر آپ کے دوش سے اتار لی آپ گھوڑے پر سوار ہوئے اور آواز بلند کی کہ کہاں ہیں ربیعہ اور ہمدان۔ فوراً یہ دونوں جاں نثار قبیلے اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے اور لوگوں کو آپ سے دور کیا آپ یہاں سے مدائن کی طرف روانہ ہوئے مگر جراح ابن قبیصہ اسدی ایک شخص انھی خوارج میں سے کمین گاہ میں چھپ گیا اور اس نے آپ پر خنجر سے حملہ کیا جس سے آپ کی ران زخمی ہو گئی۔ حملہ آور گرفتار کیا گیا اور اسے سزا دی گئی۔ عرصہ تک مدائن میں علاج ہونے کے بعد آپ اچھے ہوئے اور پھر معاویہ کی فوج سے مقابلہ کی تیاری کی۔

**صلح** | امیر شام کو حضرت امام حسن علیہ السلام کی فوج کی حالت اور لوگوں کی بے وفائی کا حال معلوم ہو چکا تھا اس لئے وہ سمجھتے تھے کہ امام حسن علیہ السلام کیلئے جنگ کرنا ممکن نہیں ہے مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی یقین رکھتے تھے کہ حضرت امام حسنؑ کتنے ہی بے بس اور بے کس ہوں مگر وہ علیؑ ذوالفقار کے بیٹے اور پیغمبرؐ کے نواسے ہیں اس لئے وہ ایسے شرائط پہ ہرگز صلح نہ کریں گے جو حق پرستی کے خلاف ہوں اور

جن سے باطل کی حمایت ہوتی ہو اس کو نظر میں رکھتے ہوئے انھوں نے ایک طرف تو آپ کے ساتھیوں کو عبداللہ ابن عامر کے ذریعہ سے یہ پیغام دلوایا کہ اپنی جان کے پیچھے نہ پڑو اور خوں ریزی نہ ہونے دو۔ اس سلسلے میں کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی گئیں اور کچھ بزدلوں کو اپنی تعداد کی زیادتی سے خوف زدہ کیا گیا اور دوسری طرف حضرت امام حسنؑ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ جن شرائط پر کہیں انھی شرائط پر میں صلح کے لئے تیار ہوں۔

امام حسنؑ یقیناً اپنے ساتھیوں کی غداری کو دیکھتے ہوئے جنگ کرنا مناسب نہ سمجھتے تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ یہ ضرور پیش نظر تھا کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ باطل کی تقویت کا دھبا میرے دامن پر نہ آنے پائے۔ اس گھرانے کو حکومت و اقتدار کی ہوس تو کبھی تھی ہی نہیں انھیں تو مطلب اس سے تھا کہ خلق خدا کی بہتری ہو اور حدود و حقوق الٰہی کا اجرا ہو۔ اب امیر معاویہ نے جو آپ سے منھ مانگے شرائط پر صلح کرنے کے لئے آمادگی ظاہر کی تو اب مصالحت سے انکار کرنا شخصی اقتدار کی خواہش کے علاوہ اور کچھ نہیں قرار پا سکتا تھا۔ یہ کہ امیر شام صلح کے شرائط پر عمل نہ کریں گے بعد کی بات تھی جب تک صلح نہ ہوتی یہ انجام سامنے کہاں آسکتا تھا اور حجت تمام کیونکر ہو سکتی تھی، پھر بھی آخری جواب دینے سے قبل آپ نے ساتھ والوں کو جمع کیا اور تقریر فرمائی "آگاہ رہو کہ تم میں دو خوں ریز لڑائیاں ہو چکی ہیں جن میں بہت لوگ قتل ہوئے کچھ مقتول صفین میں ہوئے جن کے لئے آج تک رو رہے ہو اور کچھ مقتول نہروان کے جن کا معاوضہ طلب کر رہے ہو۔ اب اگر تم موت پر راضی ہو تو ہم اس پیغام صلح کو قبول نہ کریں

اور ان سے اللہ کے بھروسے پر تلواروں سے فیصلہ کرائیں اور اگر زندگی کو دوست رکھتے ہو تو ہم اس کو قبول کریں اور تمھاری مرضی پر عمل کریں" جواب میں لوگوں نے ہر طرف سے پکارنا شروع کیا کہ "ہم زندگی چاہتے ہیں، ہم زندگی چاہتے ہیں۔ آپ صلح کر لیجئے"۔ اس کا نتیجہ تھا کہ آپ نے صلح کے شرائط مرتب کر کے معاویہ کے پاس روانہ کئے

**شرائط صلح** اس صلحنامہ کے مکمل شرائط حسب ذیل تھے۔

(۱) یہ کہ معاویہ حکومت اسلام میں کتاب خدا اور سنت رسولؐ پر عمل کریں گے۔

(۲) دوسرے یہ کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی خلیفہ کے نامزد کرنے کا حق نہ ہوگا۔

(۳) یہ کہ شام و عراق و حجاز و یمن سب جگہ کے لوگوں کے لئے امان ہوگی۔

(۴) یہ کہ حضرت علیؑ کے اصحاب اور شیعہ جہاں بھی ہیں ان کے جان و مال اور ناموس و اولاد محفوظ رہیں گے۔

(۵) معاویہ حسنؑ ابن علیؑ اور ان کے بھائی حسینؑ ابن علیؑ اور خاندان رسولؐ میں سے کسی کو بھی کوئی نقصان پہنچانے یا ہلاک کرنے کی کوشش نہ کریں گے نہ خفیہ طریقہ پر اور نہ علانیہ۔ اور ان میں سے کسی کو کسی جگہ دھمکایا اور ڈرایا نہیں جائے گا

(۶) جناب امیر علیہ السلام کی شان میں کلمات نازیبا جواب تک مسجد جامع اور قنوت نماز میں استعمال ہوتے رہے ہیں وہ ترک کر دیئے جائیں۔ آخری شرط کی منظوری میں معاویہ کو عذر ہوا تو یہ طے پایا کہ کم از کم جس موقع پر امام حسنؑ موجود ہوں اس موقع پر ایسا نہ کیا جائے۔ یہ معاہدہ ربیع الاول یا جمادی الاول ۴۱ھ کو عمل میں آیا

**صلح کے بعد** فوجیں واپس چلی گئیں۔ معاویہ کی شہنشاہی ممالک اسلامیہ میں

عمومی طور پر مسلم ہوگئی اور اب شام و مصر کے ساتھ عراق و حجاز یمن اور ایران نے بھی اطاعت کرلی حضرت امام حسن علیہ السلام کو اس صلح کے بعد اپنے بہت سے ساتھیوں کی طرف سے جس طرح کے دل خراش اور توہین آمیز الفاظ کا سامنا کرنا پڑا ان کا برداشت کرنا انھی کا کام تھا وہ لوگ جو کل تک امیر المومنین کہہ کے تسلیم بجالاتے تھے "آج مذل المومنین" یعنی مومنین کی جماعت کو ذلیل کرنے والے کے الفاظ سے سلام کرنے لگے پھر بھی امام حسنؑ نے صبر و استقلال اور نفس کی بلندی کے ساتھ ان تمام ناگوار حالات کو برداشت کیا اور معاہدہ پر سختی کے ساتھ قائم رہے مگر اُدھر یہ ہوا کہ امیر شام نے جنگ کے ختم ہوتے ہی اور سیاسی اقتدار کے مضبوط ہوتے ہی عراق میں داخل ہو کر نخیلہ میں جسے کوفہ کی سرحد سمجھنا چاہیے قیام کیا اور جمعہ کے خطبے کے بعد یہ اعلان کردیا کہ "میرا مقصد جنگ سے کوئی یہ نہ تھا کہ تم لوگ نماز پڑھنے لگو۔ روزے رکھنے لگو حج کردیا زکوٰۃ ادا کرو، یہ سب تو تم کرتے ہی ہو میرا مقصد تو بس یہ تھا کہ میری حکومت تم پر مسلم ہو جائے اور یہ مقصد میرا حسنؑ کے اس معاہدہ کے بعد پورا ہوگیا اور باوجود تم لوگوں کی ناگواری کے خدا نے مجھے کامیاب کردیا۔ رہ گئے وہ شرائط جو میں نے حسنؑ کے ساتھ کئے ہیں وہ سب میرے پیروں کے نیچے ہیں، ان کا پورا کرنا یا نہ کرنا میرے ہاتھ کی بات ہے"، مجمع میں ایک سناٹا چھایا ہوا تھا مگر اب کس میں دم تھا کہ وہ اس کے خلاف زبان کھولتا۔ انتہا ہے کہ کوفہ میں امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی موجودگی میں امیر شام نے حضرت امیر اور امام حسنؑ کی شان میں کلمات ناز یبا استعمال کیے جن کو سنکر امام حسینؑ بھائی کی جانب سے جواب دینے کے لئے کھڑے ہوگئے مگر امام حسنؑ نے آپ کو بٹھا دیا۔ اور خود کھڑے ہو کر نہایت

مختصر اور جامع الفاظ میں امیر شام کی تقریر کا جواب دیا اسی طرح جتنی معاہدہ کی شرطیں تھیں۔ امیر شام نے سب کی مخالفت کی اور کسی ایک پر بھی عمل نہیں کیا۔

باوجودیکہ آپ بالکل خاموشی کی زندگی گذار رہے تھے۔ مگر آپ خود بھی اس دور میں بنی امیہ کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہیں تھے۔ ایک طرف غلط پروپگنڈے اور بے بنیاد الزامات جن سے ان کی بلندی مرتبہ پر عام نگاہوں میں حرف آئے مثلاً کثرت ازدواج اور کثرت طلاق یہ چیز اپنی جگہ پر شریعت اسلام میں جائز ہے مگر بنی امیہ کے پروپیگنڈے نے اس کو حضرت امام حسنؑ کی نسبت ایسے ہولناک طریقہ پر پیش کیا جو ہرگز قابل قبول نہیں ہے۔ دوسرے بنی امیہ کے ہوا خواہوں کا بُرا برتاؤ، سخت کلامی، اور دشنام دہی اس کا اندازہ امام حسینؑ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے جو آپ نے مروان سے فرمائے تھے جب امام حسنؑ کے جنازے کے ساتھ مروان رو رہا تھا امام حسین علیہ السلام نے فرمایا "آج تم روتے ہو، حالانکہ اس کے پہلے تم انھیں غم و غصہ کے گھونٹ پلاتے تھے جنھیں دل ہی خوب جانتا ہے"۔ مروان نے کہا، ٹھیک ہے مگر وہ سب میں ایسے انسان کے ساتھ کرتا تھا جو اس پہاڑ سے زیادہ قوت برداشت رکھنے والا تھا۔

## اخلاق و اوصاف

امام حسنؑ کی ایک غیر معمولی صفت جس کے دوست اور دشمن سب معترف تھے وہ یہی حلم کی صفت تھی جس کا اقرار ابھی مروان کی زبان سے آپ سُن چکے ہیں۔ حکومت شام کے ہوا خواہ صرف اس لیے جان بوجھ کر سخت کلامی اور بدزبانی کرتے تھے کہ امام حسنؑ کو غصہ آجائے اور کوئی ایسا اقدام کر دیں جس سے آپ پر عہد شکنی کا الزام عائد کیا جاسکے اور اس طرح خوں ریزی کا ایک بہانہ ہاتھ آئے مگر آپ ایسی صورتوں میں حیرتناک قوت برداشت سے کام لیتے تھے اور جو کسی دوسرے انسان کا

کام نہیں ہے آپ کی سخاوت اور مہمان نوازی بھی عرب میں مشہور تھی۔ آپ نے تین مرتبہ اپنا تمام مال راہ خدا میں لٹا دیا اور دو مرتبہ تمام اپنی ملکیت، یہاں تک کہ اثاث البیت اور لباس تک کو آدھوں آدھ راہ خدا میں دے دیا۔

سائلوں کو ایک دفعہ میں ہزاروں روپیے دے دیئے ہیں اور حقیقت میں معاویہ کے ساتھ شرائط صلح میں جو بہت سے مورخین کے بیان کے مطابق ایک خاص رقم کی شرط ملتی ہے کہ معاویہ کی جانب سے ہر سال امام حسن علیہ السّلام کے پاس روانہ کی جائے وہ اگر صحیح ہو تو اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کے بیت المال کا کچھ روپیہ مستحقین تک بھی پہنچ سکے۔ ہرگز اپنی ذات پر صرف کرنے کے لئے آپ نے اس رقم کی شرط قرار نہیں دی تھی۔ چنانچہ جو کچھ پاس موجود ہوتا تھا چاہے زیادہ سے زیادہ رقم کیوں نہ ہو آپ فوراً سائلوں کو عطا فرما دیتے تھے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ "باوجودیکہ آپ خود ضرورتمند ہیں پھر بھی کیا بات ہے کہ سائل کو رد نہیں فرماتے"؟ آپ نے فرمایا "میں خود خدا کی بارگاہ کا سائل ہوں مجھے شرم آتی ہے کہ خود سائل ہوتے ہوئے دوسرے سائلوں کے سوال کو رد کردوں اس صورت میں مجھے کیا حق ہوگا کہ میں اپنے خدا سے اپنے سوال کے پورا ہونے کی تمنا رکھوں"۔

اس کے ساتھ آپ کے علمی کمالات بھی دھکے جن کے سامنے دنیا سر خم کرتی تھی۔ اگرچہ عبداللہ ابن عباس امیرالمومنینؑ سے حاصل کیے ہوئے علوم سے دنیا کے علم میں اپنا ڈنکا بجا رہے تھے۔ مگر جب امام حسنؑ کے خداداد علم کا سامنا ہوجاتا تھا تو خاندان رسالت کی بزرگی کا دنیا کو اقرار کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ایک سائل نے مسجد نبوی میں آکر ایک آیت کی تفسیر ابن عباس سے بھی پوچھا، عبداللہ ابن عمر سے بھی پوچھی

اور پھر امام حسنؑ سے دریافت کی اور آخر میں اس نے اقرار کیا کہ امام حسن علیہ السّلام کا جواب یقیناً ان دونوں سے بہتر تھا۔ اکثر آپ نے اپنے دشمن معاویہ کے دربار اور وہاں کے مخالف ماحول میں فضائل اہل بیتؑ اور مناقب امیر المومنینؑ پر ایسی موثر تقریریں فرمائی ہیں کہ دشمنوں کے سر جھک گئے اور آپ کی فصاحت و بلاغت اور حقانیت کا ان کے دلوں پر سکّہ قائم ہو گیا۔

عبادت بھی آپ کی امتیازی حیثیت رکھتی تھی، بیس یا پچیس حج پاپیادہ کئے جب موت، قبر، قیامت اور صراط کو یاد فرماتے تھے تو رونے لگتے تھے جب بارگاہ الٰہی میں اعمال کے پیش ہونے کا خیال آتا تھا تو ایک نعرہ مار کر بیہوش ہو جاتے تھے اور جب نماز کو کھڑے ہوتے تھے تو جسم لرزنے لگتا تھا۔

**وفات** اس بے ضرر اور خاموش زندگی کے باوجود بھی امام حسن علیہ السلام کے خلاف وہ خاموش حربہ استعمال کیا گیا جو سلطنت بنی امیہ میں اکثر صرف کیا جا رہا تھا، امیر شام نے اشعث ابن قیس کی بیٹی جعدہ کے ساتھ جو حضرت امام حسن علیہ السلام کی زوجیت میں تھی ساز باز کر کے ایک لاکھ درہم انعام اور اپنے فرزند یزید کے ساتھ شادی کا وعدہ کیا اور اس کے ذریعے حضرت کو زہر دلوایا، امام حسنؑ کے کلیجے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور حالت خراب ہوئی۔ آپ نے اپنے بھائی حضرت امام حسینؑ کو پاس بلایا اور وصیت کی کہ اگر ممکن ہو تو مجھے جد بزرگوار رسولؐ خدا کے جوار میں دفن کرنا لیکن اگر مزاحمت ہو تو ایک قطرہ خون گرنے نہ پائے میرے جنازے کو واپس لے آنا اور

جنت البقیع میں دفن کرنا - ۲۸ صفر ۵۰ھ کو امام حسنؑ دنیا سے رخصت
ہو گئے۔ حسینؑ حسب وصیت بھائی کا جنازہ روضۂ رسولؐ کی طرف لے گئے
مگر جیسا کہ امام حسنؑ کو اندیشہ تھا وہی ہوا۔ ام المومنین عائشہ اور مروان
وغیرہ نے مخالفت کی، نوبت یہ پہنچی کہ مخالف جماعت نے تیروں کی بارش
کر دی اور کچھ تیر جنازہ امام حسنؑ تک پہنچے بنی ہاشم کے اشتعال کی کوئی
انتہا نہ تھی مگر امام حسین علیہ السلام نے بھائی کی وصیت پر عمل کیا اور
امام حسن علیہ السلام کا تابوت واپس لا کر جنت البقیع میں دفن کر دیا۔

# تیسرے امام حضرت سید الشہداء
# ابو عبد اللہ الحسین علیہ السلام

**نام و نسب** حسینؑ نام اور ابو عبد اللہ کنیت ہے پیغمبر خدا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے چھوٹے نواسے اور علیؑ و فاطمہؑ کے چھوٹے صاحبزادے تھے

**ولادت** ہجرت کے چوتھے سال تیسری شعبان پنجشنبہ کے دن آپ کی ولادت ہوئی اس خوش خبری کو سنکر جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تشریف لائے بیٹے کو گود میں لیا پیار کیا داہنے کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی اور اپنی زبان منہ میں دیدی پیغمبرؐ کا مقدس لعاب دہن حسینؑ کی غذا بنا ساتویں دن عقیقہ کیا گیا۔ آپ کی پیدائش سے تمام خاندان میں خوشی اور مسرت محسوس کی جاتی تھی مگر آنے والے حالات کا علم پیغمبرؐ کی آنکھوں سے آنسو برساتا تھا اور اسی وقت سے حسینؑ کے مصائب کا چرچا اہلبیت رسولؐ کے زبانوں پر آنے لگا۔

**نشو و نما** پیغمبر اسلامؐ کی گود جو اسلام کی تربیت کا گہوارہ تھی اب الا دو بچوں کی پرورش میں مصروف ہوئی ایک حسنؑ دوسرے حسینؑ اور اس طرح ان دونوں کا اور اسلام کا ایک ہی گہوارہ تھا جس میں دونوں پروان چڑھے

رہے تھے ایک طرف پیغمبر اسلام جن کی زندگی کا مقصد ہی اخلاق انسانی کی تکمیل تھی اور دوسری طرف حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب جو اپنے عمل سے خدا کی مرضی کے خریدار بن چکے تھے تیسری طرف حضرت فاطمہ زہرا جو خواتین کے طبقہ میں پیغمبرؐ کی رسالت کو عملی طور پر پہونچانے کے لئے ہی قدرت کی طرف سے پیدا ہوئی تھیں اس نورانی ماحول میں حسینؑ کی پرورش ہوئی۔

**رسولؐ کی محبت** جیسا کہ حضرت امام حسنؑ کے حالات میں لکھا جا چکا ہے۔ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے دونوں نواسوں کے ساتھ انتہائی محبت فرماتے تھے سینہ پر بٹھاتے تھے۔ کاندھوں پر چڑھاتے تھے اور مسلمانوں کو تاکید فرماتے تھے کہ ان سے محبت رکھو مگر چھوٹے نواسے کے ساتھ آپ کی محبت کے انداز کچھ امتیاز خاص رکھتے تھے ایسا ہوا ہے کہ نماز میں سجدہ کی حالت میں حسینؑ پشت مبارک پر آگئے تو سجدہ میں طول دیا یہاں تک کہ بچہ خود سے بخوشی پشت پر سے علیحدہ ہو گیا اس وقت سر سجدے سے اٹھایا کبھی خطبہ پڑھتے ہوئے حسینؑ مسجد کے دروازے سے داخل ہونے لگے اور زمین پر گر گئے تو رسولؐ نے اپنا خطبہ قطع کر دیا اور منبر سے اتر کر بچے کو زمین سے اٹھایا اور پھر منبر پر تشریف لے گئے اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ "دیکھو یہ حسینؑ ہے، اسے خوب پہچان لو اور اس کی فضیلت کو یاد رکھو" رسولؐ نے حسینؑ کے لئے یہ الفاظ بھی خاص طور سے فرمائے تھے کہ "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں" مستقبل نے بتا دیا کہ رسولؐ کا مطلب یہ تھا کہ میرا نام اور میرا کام دنیا میں حسینؑ کی بدولت قائم رہے گا

**رسولؐ کی وفات کے بعد** امام حسین علیہ السلام کی عمر ابھی چھ سال

کی تھی جب انتہائی محبت کرنے والے نانا کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ اب پچیس برس تک حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی خانہ نشینی کا دور رہا ہے اس زمانہ کے طرح طرح کے ناگوار حالات امام حسینؑ دیکھتے رہے اور اپنے والد بزرگوار کی سیرت کا بھی مطالعہ فرماتے رہے یہی وہ دور تھا جس میں آپ نے جوانی کے حدود میں قدم رکھا اور پھر پورے شباب کی منزلوں کو طے کیا ۳۵ھ میں جب حسینؑ کی عمر ۳۱ برس کی تھی عام مسلمانوں نے حضرت علی ابن ابی طالبؑ کو بحیثیت خلیفہ اسلام تسلیم کیا یہ امیر المومنینؑ کی زندگی کے آخری پانچ سال تھے جن میں جمل صفین اور نہروان کی لڑائیاں ہوئیں اور امام حسینؑ ان میں اپنے بزرگ مرتبہ باپ کی نصرت اور حمایت میں شریک ہوئے اور شجاعت کے جوہر بھی دکھلائے۔ سنہ ۴۰ھ میں جناب امیر علیہ السلام مسجد کوفہ میں شہید ہوئے اور اب امامت و خلافت کی ذمہ داریاں امام حسن علیہ السلام کے سپرد ہوئیں جو حضرت امام حسینؑ کے بڑے بھائی تھے۔ حسینؑ نے ایک باوفا اور اطاعت شعار بھائی کی طرح حسنؑ کا ساتھ دیا اور جب امام حسنؑ نے اپنے شرائط کے ماتحت جن سے اسلامی مفاد محفوظ رہ سکے معاویہ کے ساتھ صلح کر لی تو امام حسینؑ بھی اس مصلحت پر راضی ہو گئے اور خاموشی کی زندگی گذارنے لگے۔ دس برس تک امام حسنؑ کی زندگی میں اور دس برس تک امام حسنؑ کے بعد آپ خاموشی اور گوشہ نشینی کے ساتھ عبادت اور شریعت کی تعلیم و اشاعت میں مصروف رہے مگر معاویہ نے ان شرائط کو جو امام حسن علیہ السلام کے ساتھ ہوئے تھے بالکل پورا نہ کیا خود امام حسن علیہ السلام کو امیر شام کی سازش ہی سے زہر دیا گیا حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے شیعوں کو چن چن کے قید کیا گیا سر قلم کیئے گئے اور سولی پر چڑھایا گیا اور سب سے آخر میں اس شرط کے بالکل خلاف

"معاویہ کو اپنے بعد کسی کو جانشین مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا"۔ معاویہ نے یزید کو اپنے بعد کے لئے ولیعہد بنا دیا اور تمام مسلمانوں سے اس کی بیعت حاصل کرنے کی کوشش کی گئی اور زور و زر دونوں طاقتوں کو کام میں لا کر دنیائے اسلام کے بڑے حصے کا سر جھکوا دیا گیا۔

**اخلاق و اوصاف** امام حسین علیہ السّلام سلسلۂ امامت کی تیسری فرد تھے عصمت و طہارت کا مجسمہ تھے، آپ کی عبادت، آپ کے زہد، آپ کی سخاوت اور آپ کے کمالِ اخلاق کے دوست و دشمن سب ہی قائل تھے پچیس ۲۵ حج آپ نے پاپیادہ کیے آپ میں سخاوت اور شجاعت کی صفت کو خود رسول اللہؐ نے بچپنے میں ایسا نمایاں پایا کہ فرمایا "حسینؑ میں میری سخاوت اور میری جرأت ہے"، چنانچہ آپ کے دروازے پر مسافروں اور حاجتمندوں کا سلسلہ برابر قائم رہتا تھا اور کوئی سائل محروم واپس نہیں ہوتا تھا اس وجہ سے آپ کا لقب ابوالمساکین ہوگیا تھا۔ راتوں کو روٹیوں اور کھجوروں کے پشتارے اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لیجاتے تھے اور غریب محتاج بیواؤں اور یتیم بچوں کو پہنچاتے تھے جن کے نشان پشت مبارک پر پڑ گئے تھے۔ حضرت ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ "جب کسی صاحب ضرورت نے تمہارے سامنے سوال کے لئے ہاتھ پھیلا دیا تو گویا اس نے اپنی عزت تمہارے ہاتھ بیچ ڈالی اب تمہارا فرض یہ ہے کہ تم اسے خالی ہاتھ واپس نہ کرو کم سے کم اپنی ہی عزت نفس کا خیال کرو۔"

غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ آپ عزیزوں کا سا برتاؤ کرتے تھے ذرا ذرا سی بات پر آپ انھیں آزاد کر دیتے تھے۔ آپ کے علمی کمالات کے سامنے دنیا کا

سر جھکا ہوا تھا۔ مذہبی مسائل اور اہم مشکلات میں آپ کی طرف رجوع کی جاتی تھی۔ آپ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ صحیفہ حسینیہ کے نام سے اس وقت بھی موجود ہے آپ رحمدل ایسے تھے کہ دشمنوں پر بھی وقت آنے پر رحم کھاتے تھے اور ایثار ایسا تھا کہ اپنی ضرورت کو نظر انداز کر کے دوسروں کی ضرورت کو پورا کرتے تھے ان تمام بلند صفات کے ساتھ متواضع اور منکسر ایسے تھے کہ راستے میں چند مساکین بیٹھے ہوئے اپنے بھیک کے ٹکڑے کھا رہے تھے اور آپ کو پکار کر کھانے میں شرکت کی دعوت دی تو حضرت فوراً زمین پر بیٹھ گئے۔ اگرچہ کھانے میں شرکت نہیں فرمائی اس بنا پر کہ صدقہ آلِ محمدؐ پر حرام ہے مگر ان کے پاس بیٹھنے میں کوئی عذر نہیں ہوا

اس خاکساری کے باوجود آپ کی بلندی مرتبہ کا یہ اثر تھا کہ جس مجمع میں آپ تشریف فرما ہوتے تھے لوگ نگاہ اٹھا کر بات نہیں کرتے تھے جو لوگ آپ کے خاندان کے مخالف تھے وہ بھی آپ کی بلندی مرتبہ کے قائل تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت امام حسین علیہ السلام نے امیر شام معاویہ کو ایک سخت خط لکھا جس میں ان کے اعمال و افعال اور سیاسی حرکات پر نکتہ چینی کی تھی اس خط کو پڑھ کر معاویہ کو بڑی تکلیف محسوس ہوئی۔ پاس بیٹھنے والے خوشامدیوں نے کہا کہ آپ بھی اتنا ہی سخت خط لکھیے۔ معاویہ نے کہا میں جو کچھ لکھوں وہ اگر غلط ہو تو اس سے کوئی نتیجہ نہیں اور اگر صحیح لکھنا چاہوں تو بخدا حسینؑ میں مجھے ڈھونڈھنے سے کوئی عیب نہیں ملتا۔

آپ کی اخلاقی جرأت، راست بازی اور راست کرداری، قوت اقدام

جوش عمل اور ثبات و استقلال، صبر و برداشت کی تصویریں کربلا کے مرقع میں محفوظ ہیں۔ اس سب کے ساتھ آپ کی امن پسندی یہ تھی کہ آخر وقت تک دشمن سے صلح کرنے کی کوشش جاری رکھی مگر عزم وہ تھا کہ جان دیدی جو صحیح راستہ پہلے دن اختیار کر لیا تھا اس سے ایک انچ نہ ہٹے۔ انھوں نے بحیثیت ایک فرزند کے باپ کی اطاعت کی اور چھوٹے بھائی ہو کر بھائی کی اطاعت کی اور پھر بحیثیت ایک سردار کے کربلا میں ایک پوری جماعت کی قیادت کی اس طرح کہ اپنے وقت میں وہ اطاعت بھی بے مثل اور دوسرے وقت میں یہ قیادت بھی لاجواب تھی۔

**واقعہ کربلا** حضرت امام حسن علیہ السلام اور امیر شام معاویہ بن ابوسفیان میں جو صلح ہوئی تھی اس کی ایک خاص اہم شرط یہ تھی کہ معاویہ کو اپنے بعد کسی جانشین کے مقرر کرنے کا حق نہ ہوگا مگر سب شرطوں کو عملی طور سے پامال کرتے ہوئے معاویہ نے اس شرط کی بھی نہایت شدت کے ساتھ مخالفت کی اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے بعد کے لئے نامزد کر دیا۔ بلکہ اپنی زندگی ہی میں ممالک اسلامیہ کا دورہ کر کے بحیثیت آیندہ خلیفہ کے یزید کی بیعت حاصل کر لی۔ اس وقت حضرت امام حسین علیہ السلام نے بیعت سے انکار فرما دیا۔ امیر شام نے آپ کو موافق بنانے میں ہر طرح کی کوشش کی مگر نتیجہ میں کامیابی ہوئی۔ یزید نہ صرف یہ کہ اصولی طور پر اس کی خلافت ناجائز تھی بلکہ اپنے اخلاق، اوصاف اور کردار کے لحاظ سے اتنا پست تھا کہ تخت سلطنت پر اس کا برقرار ہونا اسلامی شریعت کے لئے سخت خطرے کا باعث تھا وہ شراب خوار، بدکار اور ایسے اخلاقی جرائم کا مرتکب تھا جن کا ذکر بھی تہذیب اور شائستگی کے خلاف ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت لینے پر مصر تھا گویا وہ اپنے خلاف شریعت افعال کی

صحت کے لئے پیغمبر اسلامؐ کے نواسے سے سند حاصل کرنا چاہتا تھا معاویہ کے مرنے کے بعد جب یزید تخت پر بیٹھا تو سب سے پہلی فکر اس کو یہی ہوئی کہ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بیعت حاصل کی جائے اس نے اپنے گورنر کو جو مدینہ میں تھا معاویہ کی خبر انتقال کے ساتھ بیعت کے لئے بھی لکھا۔ ولید نے جو مدینہ کا گورنر تھا امام حسینؑ کو بلا کر یزید کا پیغام پہنچایا آپ پہلے ہی سے یہ طے کئے ہوئے تھے کہ یزید کی بیعت آپ کے لئے ہرگز ممکن نہیں ہے بیعت نہ کرنے کی صورت میں جو نتائج ہونگے انھیں بھی خوب جانتے تھے مگر دین خدا کی حفاظت اور شریعت اسلام کی خاطر آپ کو سب گوارا تھا۔ آپ ولید کو مناسب جواب دیکر اپنے مکان پر واپس آگئے۔ مدینہ میں قیام اس کے بعد نامناسب خیال فرما کر ہجرت کا مضبوط ارادہ کر لیا۔

سنہ ۶۰ھ رجب کا مہینہ ۲۸ تاریخ تھی جب حضرت اپنے نانا کے جوار کو چھوڑ کر ظالموں کے جور و ستم سے سفر غربت اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ مکہ معظمہ عرب کے بین الاقوامی قانون اور پھر اسلامی تعلیمات کے رو سے جائے پناہ اور امن و امان کی جگہ تھی۔ آپ نے مکہ میں ایک پناہ گزیں کی حیثیت سے قیام فرمایا آپ کے ساتھ آپ کے قریبی اعزہ تھے جن میں خاندان رسولؐ کی محترم بیبیاں اور کمسن بچے بھی تھے آپ اپنی طرف سے کسی خونریزی اور جنگ کا ارادہ نہیں رکھتے تھے حج کا زمانہ بھی قریب تھا اور حضرتؑ کی دلی تمنا تھی کہ اس سال خانہ کعبہ کا حج ضرور فرمائیں جبکہ آپ مکہ ہی میں موجود ہیں مگر اسباب

ایسے پیدا ہوئے کہ وہ بزرگوار جو اس کے پہلے پچیس حج خانہ کعبہ کے اپنے وطن مدینہ سے آکر پا پیادہ بجالا چکا تھا اس وقت مکہ میں موجود ہوتے ہوئے بھی حج کرنے سے مجبور ہو گیا، ظالم حکومت شام کی طرف سے کچھ لوگ حاجیوں کے لباس میں بھیجے گئے کہ وہ جس حالت میں بھی موقع ملے حضرت امام حسین علیہ السلام کو خانہ کعبہ کے پاس ہی قتل کر ڈالیں۔

حضرت نہ چاہتے تھے کہ آپ کی وجہ سے مکہ کے اندر خونریزی ہو اور خانہ کعبہ کی حرمت برباد ہو۔ دو روز حج کو باقی تھے جب آپ تمام اہل و عیال اور اعزہ کے ساتھ مکہ معظمہ سے روانہ ہو گئے۔ اب آپ کہاں جاتے۔ کوفہ کے لوگ برابر خط بھیج رہے تھے کہ آپ یہاں تشریف لائیں اور ہماری مذہبی رہنمائی کریں۔ جب کہ آپ مکہ سے نکلنے پر مجبور ہو چکے تھے تو اب کوفہ ہی وہ مقام ہو سکتا تھا جس کی طرف آپ رخ کرتے۔ یہاں کے حالات کو دیکھنے کے لئے آپ اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو بھیج چکے تھے۔ ۸ ذی الحجہ کو حضرت مکہ معظمہ سے کوفہ کے ارادے سے روانہ ہوئے مگر یہی وہ وقت تھا جب کوفہ میں انقلاب ہو چکا تھا۔ شروع میں تو کوفہ کے لوگوں نے حضرت مسلم کا خیر مقدم کیا اور ۱۸ ہزار آدمیوں نے بیعت کی مگر جب یزید کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے حاکم کوفہ نعمان ابن بشیر کو معزول کیا اور ابن زیاد کو کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔

یہ شخص بڑا ہی ظالم اور تشدد پسند تھا اس نے کوفہ میں آکر بڑے سخت احکام نافذ کئے اور تمام اہل کوفہ پر خوف و دہشت طاری ہو گئی۔ سب نے جناب مسلم کا ساتھ چھوڑ دیا اور آخر تن تنہا ہزاروں کا مقابلہ کرنے کے بعد

بڑی مظلومی اور بے کسی کے ساتھ ۹ ذی الحجہ کو وہ شہید کر ڈالے گئے۔ حضرت امام حسینؑ عراق کے راستے میں منزل زبالہ میں تھے جب حضرت کو مسلم کی خبر شہادت معلوم ہوئی اس کا حضرت پر بڑا اثر پڑا مگر عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہ آیا واپسی کا بھی کوئی موقع نہ تھا سفر جاری رہا یہاں تک کہ ذو حسم کی منزل میں ابن زیاد کی فوج میں سے ایک ہزار کا لشکر حُر بن یزید ریاحی کی سرداری میں آپ کا راستہ روکنے کے لئے پہونچ گیا یہ دشمن کی فوج تھی مگر حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان کے ساتھ رحم و کرم کا وہ مظاہرہ فرمایا جو دنیا کے انسانیت میں یادگار رہیگا تمام فوج کو پیاسا دیکھ کر جتنا پانی ساتھ تھا وہ سب پلا دیا اور ان بے آب استوں میں اپنے اہل حرم اور بچوں کی پیاس کے لحاظ سے پانی کا کوئی ذخیرہ محفوظ نہ رکھا اس کے بعد بھی یزیدی فوج نے اپنے حاکم کی ہدایت کے موافق آپ کے ساتھ تشدد اختیار کیا۔ آپ کو آگے بڑھنے یا واپس جانے سے روک دیا اب ۶۱ھ کا پہلا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ دوسری محرم کو حضرت کربلا کی زمین پر پہونچے اور یہیں اترنے پر مجبور ہو گئے۔ دوسرے دن سے یزید کا ٹڈی دل لشکر کربلا کے میدان میں آنا شروع ہو گیا اور تمام راستے بند کر دیئے گئے۔

امام حسین علیہ السلام کے ساتھ صرف ۷۲ جانباز تھے اور اُدھر ہزاروں کا لشکر پہلے سات دن تک امن قائم رکھنے کے لئے صلح کی کوشش ہوتی رہی حضرت یہاں تک تیار ہوئے کہ عرب کا ملک چھوڑ دیں۔ کسی دور دراز سرزمین پر چلے جائیں اور اس طرح اپنے کو بیعت یزید سے الگ رکھتے ہوئے بھی ایسی صورت پیدا کر دیں کہ جنگ کی ضرورت پیش نہ آئے مگر نویں محرم کی سہ پہر کو صلح کے

امکانات ختم ہو گئے ابن زیاد کے اس خط سے جو شمر کے ہاتھ عمر سعد کے پاس بھیجا گیا، اس میں لکھا تھا یا حسینؑ غیر مشروط طور پر اطاعت قبول کریں یا ان سے جنگ کی جائے" اس خط کے پہونچتے ہی فوج یزیدی نے حملہ کر دیا۔

باوجودیکہ ساتویں سے پانی بند ہو چکا تھا امام حسین علیہ السلام کے سامنے ان کے اہل حرم اور چھوٹے بچوں کی بیتابی کے مناظر، العطش کی صدائیں اور مستقبل کے حالات سب ہی کچھ تھے۔ مگر یزید کی بیعت اب بھی اسی طرح غیر ممکن تھی جس طرح اس کے پہلے بے شک آپ نے یہ چاہا کہ ایک رات کی مہلت مل جائے، آپ چاہتے تھے کہ یہ پوری رات آخری طور پر عبادت خدا میں بسر کریں اس کے علاوہ دوست و دشمن دونوں کو جنگ کا قطعی فیصلہ ہو جانے کے بعد اپنے اپنے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع مل جائے آپ نے اپنے ساتھیوں کو جمع کر کے تقریر بھی فرمائی آپ نے۔ فرمایا "کل قربانی کا دن ہے، ان ظالموں کو مجھ سے دشمنی ہے، کیا ضرورت ہے کہ تم لوگ بھی اپنی زندگی کو میرے ساتھ خطرے میں ڈالو میں تم سے اپنی بیعت اٹھائے لیتا ہوں۔ اس مدات کے پردے میں جدھر چاہو چلے جاؤ" مگر ان جانبازوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ " ہم آپ کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑیں گے"۔

عاشور کی رات ختم ہوئی۔ دسویں محرم کو صبح سے عصر تک کی مدت میں ان بہادروں نے جو کچھ کہا تھا اسے کر کے دکھایا۔ اس وفاداری، استقلال اور ہمدردی کے ساتھ حضرت امام حسین علیہ السلام کی نصرت میں دشمنوں سے مقابلہ کیا جو تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان میں حبیب ابن مظاہر، مسلم ابن عوسجہ

سوید ابن عمرو۔ انس بن حارث اور عبدالرحمٰن ابن عبدرب ایسے ستاٹھ

ستر اور اسی برس کے بڈھے تھے اور متعدد اصحاب رسولؐ بھی تھے۔ بریر ہمدانی

کنانہ ابن علیہ تغلبی نافع ابن ہلال حنظلہ ابن اسعد ایسے حفاظ قرآن تھے

اور بہت سے علماء اور راویان حدیث، بہت سے عابد اور شب زندہ دار

اور بہت سے ایسے شجاعان روزگار تھے جن کی شجاعت کے کارنامے لوگوں

کی زبان پر تھے۔

جب مددگاروں میں کوئی باقی نہ رہا تو عزیزوں کی نوبت آئی سب سے

پہلے حضرت نے جوان بیٹے علی اکبرؑ کو جو شبیہ پیغمبر بھی تھے مرنے کے لئے بھیجدیا

علی اکبرؑ نے جہاد کر کے اپنی جان دین خدا پر نثار کی۔ امام حسین علیہ السلام کو

شبیہ رسولؐ کی جدائی کا صدمہ تو بہت ہوا مگر عمل کے راستے میں آپ کی

ہمت کے حوصلے اور ولولے میں کوئی فرق نہیں آیا، عقیل کی اولاد عبداللہ

ابن جعفر کے فرزند ایک ایک کر کے رخصت ہوئے۔ امام حسنؑ کے یتیم قاسمؑ

کی جدائی آپ کو بہت شاق ہوئی مگر اپنے بزرگ مرتبہ بھائی کی وصیت کو

پورا کرتے ہوئے قاسمؑ کو بھی رخصت کر دیا۔

سب کے آخر میں فرزندان امیر المومنین علیہ السلام میدان جہاد میں گئے

جب کوئی نہ رہا تو علمدار کی باری آئی۔ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباسؑ کو حضرت

کسی طرح اجازت جہاد نہ دیتے تھے کیونکہ ان کے کاندھوں پر اسلام کا علم لہرا

رہا تھا، مگر ایک طرف بچوں کی پیاس دوسری طرف جوش جہاد عباسؑ پانی

لینے کے لئے ایک مشک اپنے ساتھ لیکر فرات کی جانب متوجہ ہوئے انھوں نے

علم کی حفاظت بھی کی۔ دشمنوں سے مقابلہ بھی کیا۔ فوج کو ہٹا کر نہر کا راستہ بھی صاف کیا اور مشک میں پانی بھی بھر لیا مگر افسوس کہ یہ پانی خیام حسینی تک پہنچنے نہیں پایا تھا کہ بہادر علمدار کے شانے قلم ہوئے۔ مشک سے تیر سے چھدی اور پانی زمین پر بہا۔ عباسؑ کی قوت ختم ہو گئی۔ گرز کے صدمے سے زمین کی طرف جھکے اور علم عباسؑ کے ساتھ زمین پر آ گیا۔ حسینؑ کی کمر شکستہ ہو گئی۔ پشت جھک گئی مگر ہمت پھر بھی نہیں ٹوٹی، اب جہاد کے میدان میں حسینؑ کے سوا کوئی نظر نہ آتا تھا مگر فہرست شہدا میں ابھی ایک بے مثال مجاہد کا نام باقی تھا جس کا جواب قربانی کی تاریخ میں نہ پہلے نظر آیا نہ بعد میں نظر آ سکتا ہے یہ چھ مہینے کا بچہ علی اصغرؑ تھا جو گہوارہ میں پیاس سے جاں بلب تھا حسینؑ در خیمہ پر تشریف لائے اور اس بچہ کو طلب فرمایا — بچہ کی عطش اور اس کی حالت کا مشاہدہ فرمایا۔ یقیناً یہ منظر ہر حساس انسان کو متاثر کرنے کے لئے کافی تھا مگر کیسے بے رحم تھے۔ وہ سخت دل فوج شام کے سپاہی جنھوں نے حسینؑ کے ہاتھوں پر اس معصوم بچے کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ رحم کھاتے بچے کو ایک جرعۂ آب سے سیراب کرتے ظلم اور شقاوت کا مظاہرہ انتہائی حد تک پہونچا دیا۔ سخت دل حرملہ کا تیر اور بچہ کا نازک گلا۔

امام حسین علیہ السلام نے یہ آخری ہدیہ بھی بارگاہ الٰہی میں پیش کر دیا تو خود بہ نفس نفیس میدان جہاد میں قدم رکھا اور باوجود اس بے کسی اور تشنگی کے جب کہ تین دن کے بھوکے اور پیاسے تھے دن بھر اصحاب و اعزہ کی لاشیں اٹھا چکے تھے اور بہتر داغ سینہ پر کھا چکے تھے بھائی کے غم سے کمر شکستہ تھی

اور اولاد کے داغ سے کلیجہ زخمی ہو گیا تھا۔ مگر جب نصرت اسلام کے لئے تلوار نیام سے نکالی تو دنیا کو حمزہؑ اور جعفرؑ کی شان اور حیدرؑ صفدر کی شجاعت یاد دلا دی آخر قربانی کی منزل سامنے آگئی۔ دشمنوں کی تلواریں نیزے اور تیر اور وہ مقدس جسم، زخموں کی کثرت، خون کے بہنے سے گھوڑے پر سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ دشمنوں نے ایذا رسانی کی کوئی حسرت باقی نہ رکھی۔ شمر کا خنجر فرزند رسولؐ کے گلے پر کیا پھر اگویا رسولؐ کا سر قلم ہوا اور نام نہاد کلمہ اسلام پڑھنے والوں نے پیغمبر اسلامؐ کے نواسے کا سر نیزہ پر بلند کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خیموں میں آگ لگا دی گئی۔ خانوادۂ عصمت کی مقدس بیبیوں کے سروں سے چادریں اتاریں گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں گھوڑوں کے سموں سے پامال کی گئیں۔

امام حسین علیہ السلام کے بعد مردوں میں صرف ایک بیمار فرزند سید سجادؑ باقی تھے جنھیں طوق و زنجیر پہنایا گیا اور بیبیوں اور بچوں کے ساتھ قید کر کے شہر بشہر پھرایا گیا کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام قیدیوں کی صورت سے لیجائے گئے اور ابن زیاد اور یزید کے درباروں میں کھڑے کیے گئے ان واقعات کا مختصر تذکرہ حضرت سید سجادؑ کے حالات میں آپ کی نظر سے گذرے گا۔

ان تمام کے مسلمانوں نے پیغمبر اسلامؐ کے فرزند کو دفن و کفن سے بھی محروم رکھا تھا مگر اس پاس کے رہنے والے قبیلۂ بنی اسد کے لوگوں نے فوج ظلم کے چلے جانے کے بعد بارہ محرم کو یعنی شہادت سے تیسرے دن دفن کیا۔

آج کربلائے معلیٰ میں حسینؑ کا روضہ انتہائی شان و شوکت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور حسینؑ کے نام کا تعزیہ اور ضریح اور علم اور مختلف مظاہرات دنیا کے ہر گوشے میں نظر آتے ہیں۔ حسینؑ دنیا میں قائم ہیں اور حسینؑ کی بدولت اسلام باقی ہے اور صداقت و استقلال و حق پرستی کے لئے امام حسین علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ تاریخ انسانیت میں بے مثال حیثیت سے باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہے گا۔

اگر واقعہ کربلا سے دنیا صحیح سبق حاصل کرے اور سیدالشہداءؑ نے کربلا میں جو بے نظیر نمونہ پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی جاری رہے تو زندگی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔

ہم میں کیا کمی ہے یہی ہے کہ ہم بلند مقاصد کے سامنے اپنے وقتی مفاد اپنے راحت و آرام، اپنی زندگی، اپنی قرابتوں اور اپنے اہل و عیال اور اولاد اور نہ جانے کتنی روپہلی سنہری مصلحتوں کا لحاظ کرتے ہیں

امام حسین علیہ السلام نے یہ مثال پیش کی ہے کہ تم بلند مقاصد کے لئے اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کے لئے تیار رہو مبارک ہوں گے وہ افراد جو اس سے سبق حاصل کریں اور اپنے کو عملی حیثیت سے ویسا ہی پیش کریں جیسا حسینؑ دنیا کو بنانا چاہتے تھے۔

# چوتھے امام

## حضرت سید الساجدین زین العابدین علیہ السلام

**نام ونسب** علیؑ نام اور زین العابدینؑ و سید الساجدینؑ نام سے زیادہ مشہور لقب ہیں آپ وہ مخصوص ہستی ہیں جنھوں نے عرب اور عجم دونوں قوموں کی ممتاز شرافتوں کو اپنی ذات میں جمع کر لیا تھا۔ دادھیال کی طرف سے روحانی اقتدار کے وارث ہوئے اور ننھیال کی جانب سے ایران کے کسروی خاندان کی شاہانہ ہمت اور بلند اوصاف کے وارث بھی ہوئے ان کے والد بزرگوار رسولِ خداؐ کے نواسے اور علیؑ اور فاطمہؑ کے بیٹے حضرت امام حسینؑ شہید کربلا تھے اور ان کی والدہ آخری تاجدار ایران یزدجرد کی بیٹی شاہ زنان تھیں جو شہربانو کے نام سے زیادہ مشہور ہیں اس وقت کہ جب عرب میں نسلی تعصب انتہا درجہ پر تھا۔ عجم کی شہزادی اسیر ہو کر عرب کے ملک میں آئیں۔ کون تھا جو قومی اور نسلی دشمنی کے ہوتے ہوئے شہنشاہ ایران کی لڑکی کو مناسب عزت واحترام کا درجہ دے سکتا وہ انسانیت کے بڑے علمبردار حضرت علی ابن ابیطالبؑ ہی تھے۔ جنھوں نے ایران کی شہزادی کو اپنے بیٹے حضرت امام حسینؑ کے ساتھ بیاہ کر عرب کی ملکہ بنا دیا اور خدا نے انھیں کو حضرت امام زین العابدینؑ کی ماں بننے کا شرف عطا فرمایا۔ اس طرح

امام زین العابدینؑ عرب کے سردار حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کے پوتے اور عجم کے شہنشاہ یزدجرد کے نواسے تھے اور اسی لئے عرب و عجم سب ہی کی نگاہ میں بڑی عزت کا درجہ رکھتے تھے۔

**ولادت** حضرت علی ابن ابی طالبؑ کوفہ میں مسند خلافت پر متمکن تھے۔ جب ۱۵ جمادی الثانی ۳۸ھ میں سید سجادؑ کی ولادت ہوئی آپ کے دادا حضرت علی ابن ابی طالبؑ اور سارے خاندان کے لوگ اس مولود کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور شاید علیؑ ہی نے پوتے میں اپنے خدوخال دیکھ کر اس کا اپنے نام پر علیؑ نام رکھا۔

**تربیت** حضرت امام زین العابدینؑ کو ماں کی محبت بھری پرورش سے فائدہ اٹھانے کا موقعہ نہیں مل سکا اس لئے کہ ان کا آپ کی ولادت کے بعد ہی انتقال ہو گیا تھا۔ اس کے بعد دو برس کا سن تھا جب آپ کے دادا حضرت امیر علیہ السلام کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ امام زین العابدین علیہ السلام اپنے چچا حضرت امام حسن علیہ السلام اور والد امام حسین علیہ السلام کی تربیت کے سایہ میں پروان چڑھے بارہ برس کی آپ کی عمر تھی جب حضرت امام حسنؑ کی وفات ہوئی اب امامت کی ذمہ داریاں آپ کے والد حضرت امام حسینؑ سے متعلق تھیں۔ شام کی حکومت پر بنی امیہ کا قبضہ تھا اور واقعات کربلا کے اسباب حسینی جہاد کی منزل کو قریب سے قریب تر لا رہے تھے۔ جب حضرت زین العابدینؑ بلوغ کی منزلوں پر پہنچ کر جوانی کی حدود میں قدم رکھ رہے تھے زین العابدینؑ نے آنکھیں کھول کر ان واقعات کی رفتار کو آگے ہی

بڑھتے ہوئے دیکھا جنھوں نے بعد میں کربلا کی قربانی کو ضروری قرار دیا۔

**شادی** اسی زمانہ میں جب کہ امام حسینؑ مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ حضرت نے اپنے فرزند سید سجادؑ کی شادی اپنی بھتیجی یعنی حضرت امام حسنؑ کی صاحبزادی کے ساتھ کر دی جن کے بطن سے امام محمد باقرؑ کی ولادت ہوئی اور اس طرح امام حسینؑ نے اپنے بعد کے لئے سلسلۂ امامت کے باقی رہنے کا سامان خود اپنی زندگی میں کر دیا۔

**واقعۂ کربلا** ۶۰ھ میں سید سجادؑ کی عمر ۲۲ سال کی تھی جب حضرت امام حسینؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور سید سجاد بھی ساتھ تھے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ راستہ ہی میں یا کربلا پہونچنے کے بعد کہاں آپ بیمار ہوئے اور دس محرم ۶۱ھ کو امام حسینؑ کی شہادت کے موقعہ پر اس قدر بیمار تھے کہ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ یقین ہے کہ ساتویں سے پانی بند ہونے کے بعد پھر سید سجادؑ کے لئے بھی پانی کا ایک قطرہ ملنا ناممکن ہو گیا۔ ایک ایسے بیمار کے لئے یہ تکلیف برداشت سے باہر تھی۔ عاشور کے دن کے اکثر حصے میں آپ غشی کے عالم میں رہے اور اسی لئے راہ خدا کے جہاد میں اس طرح شریک نہ ہو سکے جس طرح ان کے دوسرے بھائی شریک ہوئے اور اسی لئے حضرت امام حسینؑ آخری رخصت کے وقت وہ وصیتیں جو امامت کے منصب سے متعلق تھیں خود سید سجادؑ کے سپرد نہ فرما سکے بلکہ انھیں ایک کاغذ پہ لکھ کر اپنی صاحبزادی فاطمہ کبریٰ کے سپرد فرما دیا اور کہہ دیا کہ جب تمھارے بھائی ہوش میں آئیں تو انھیں دے دینا۔ قدرت کو سید سجادؑ کا امتحان دوسری طرح لینا تھا نہ حسینؑ کے بیٹے ہوتے قیدیوں کے قافلہ

بننے والے تھے۔ اُدھر امام حسینؑ شہید ہوئے اِدھر ظالم دشمنوں نے خیام اہل بیتؑ کی طرف رُخ کر دیا اور لوٹنا شروع کر دیا۔ اس وقت کا اہل حرمؑ کا اضطراب خیام میں تھلکہ اور پھر ان ہی خیموں میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے اس وقت سید سجادؑ کا کیا عالم تھا اس کے اظہار کے لئے کسی زبان یا قلم کو الفاظ ملنا غیر ممکن ہیں مگر کیا کہنا زین العابدینؑ کی عبادت خدا کا انھوں نے اس بیماری اس مصیبت اور اس آفت میں بھی اپنی عبادت کی شان میں فرق نہ آنے دیا۔

آپ نے گیارھویں محرم کی شب کو نماز فریضہ کے بعد سجدہ معبود میں خاک پر سر رکھدیا اور ایک ہی سجدہ میں پوری رات ختم کر دی سجدہ میں یہ کلمات زبان پر تھے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ حَقًّا حَقًّا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اِیْمَانًا وَّ صِدْقًا + لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ تَعَبُّدًا وَّ رِقًّا (یعنی کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے جو حق ہے یقیناً حق ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ ایمان کی رو سے اور سچائی سے کوئی معبود نہیں سوائے ایک اللہ کے۔ گواہی دیتا ہوں میں اس کی بندگی اور نیازمندی کے ساتھ) یوں ہی صبح ہو گئی۔

دوسرے دن فوج دشمن کے سالار ابن سعد نے اپنے کشتوں کو جمع کیا اور ان پر نماز پڑھ کر دفن کیا مگر حسینؑ اور ان کے ساتھیوں کی لاشوں کو اسی طرح بے گور و کفن زمین گرم کربلا پر دھوپ میں چھوڑ دیا۔ یہ موقع سید سجادؑ کے لئے انتہائی تکلیف کا تھا وہ اس وقت جب دشمن کے ہاتھ میں قید ہو کر بہنوں پھوپھیوں اور دیگر اہل حرم کے ساتھ مقتل سے گذر رہے تھے تو یہ حالت تھی کہ قریب تھا کہ روح جسم سے جدا ہو جائے۔ انھیں اس کا صدمہ تھا کہ وہ

اپنے باپ اور دوسرے عزیزوں کو دفن نہ کر سکے۔ وہ تو دشمنوں کے ہاتھ میں اسیر تھے اور کربلا سے کوفے لے جائے جا رہے تھے۔

پھر کتنا دل کو بےچین کرنے والا تھا وہ منظر جب خاندان رسولؐ کا لٹا ہوا قافلہ دربار ابن زیاد میں پہونچا۔ سید سجادؑ محسوس کر رہے تھے کہ یہ وہی کوفہ ہے جہاں ایک وقت میں علی ابن طالب علیہ السلام بادشاہ سمجھے جاتے تھے اور زینبؑ و ام کلثومؑ شاہزادیاں آج اسی کوفہ میں ظالم ابن زیاد تخت حکومت پر بیٹھا ہے اور رسولؐ کا خاندان مقید کھڑا ہے سید سجادؑ ایک بلند انسان کی طرح انتہائی صدمہ اور تکلیف کے ساتھ بھی ایک کوہ وقار بنے ہوئے خاموش کھڑے تھے ابن زیاد نے اس خاموشی کو توڑا یہ پوچھ کر کہ تمہارا کیا نام ہے؟ امام نے فرمایا علی ابن الحسینؑ۔ وہ کہنے لگا "کیا اللہ نے علی ابن الحسینؑ کو قتل نہیں کیا؟" امام نے جواب دیا "وہ میرے ایک بھائی علیؑ تھے جنھیں لوگوں نے قتل کر دیا" وہ سرکش جاہل کہنے لگا "نہیں بلکہ اللہ نے قتل کیا" امام نے یہ آیت پڑھی کہ "اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا" یعنی اللہ ہی موت کے وقت قبض روح کرتا ہے یہ دوسری بات ہے جو سب کے لئے ہے۔ اس پر ابن زیاد کو غصہ آگیا اور کہا "تم میں اب بھی مجھ کو جواب دینے اور میری بات رد کرنے کی جرات ہے" اور فوراً قتل کا حکم دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت زینبؑ دوڑ کر اپنے بھتیجے سے لپٹ گئیں اور کہا کہ مجھے بھی اس کے ساتھ قتل کیا جائے۔ سید سجادؑ نے کہا "پھوپھی چھوڑ دیجئے اور مجھے ابن زیاد کا جواب دینے دیجئے"۔

ابن زیاد تو یہ سمجھا تھا کہ کربلا میں آل محمدؐ کے بہتے ہوئے خون کو دیکھ کر سید سجادؑ کے دل میں موت کا ڈر سما گیا ہوگا اور وہ قتل کی دھمکی سے سہم جائیں گے. مگر بہادر حسینؑ کے بہادر فرزند نے تیور بدل کر کہا۔ ابن زیاد تو مجھے موت سے ڈراتا ہے کیا ابھی تک تجھے نہیں معلوم کہ قتل ہونا ہماری عادت ہے اور شہادت ہماری فضیلت ہے" یہ وہ پر زور الفاظ تھے جنہوں نے ظالم کے سر کو جھکا دیا. حکم قتل ختم ہوگیا۔ اور ثابت ہوگیا کہ حسینؑ کی شہادت سے ان کی اولاد اہل حرمؑ پہ کوئی خوف نہیں چھایا بلکہ قاتل ہی اس خاندان کے صبر و استقلال کو دیکھ کر خوف زدہ ہو چکے ہیں. کوفہ کے بعد یہ قافلہ دمشق کی طرف روانہ ہوا جس دن دمشق میں داخلہ تھا اس دن وہاں کے بازار خاص اہتمام سے سجائے گئے تھے اور تمام شہر میں آئینہ بندی کی گئی تھی اور لوگ آپس میں عیدیں مل رہے تھے۔ اس وقت حسینؑ کے اہل حرمؑ جو تکلیف محسوس کر رہے تھے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے ایسے وقت انسان کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے مگر وہ سید سجادؑ تھے جو ہر موقعہ پر ہدایت و اصلاح اور حسینی مشن کی تبلیغ کرتے جاتے تھے۔ جس وقت یہ قافلہ بازار سے گذر رہا تھا تو اموی حکومت کے ایک ہوا خواہ نے حضرت سجادؑ سے طنزیہ پوچھا اے فرزند حسینؑ کس کی فتح ہوئی؟ آپ نے جواب میں فرمایا تم کو اگر معلوم کرنا ہے کہ کس کی فتح ہوئی تو جب نماز کا وقت آئے اور اذان و اقامت کہی جائے اس وقت سمجھ لینا کہ کس کی فتح ہوئی؟ اسی طرح اس وقت جب یہ قافلہ مسجد دمشق کے دروازہ پر پہونچا تو ایک بوڑھا سامنے آیا اور اس نے قیدیوں کو دیکھ کر

کہا کہ "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم کو تباہ و برباد کیا اور ملک کو تمہارے مردوں سے خالی اور پُرامن بنایا اور خلیفۂ وقت یزید کو تم پر غلبہ عطا فرمایا"۔ ان اسیروں کے قافلہ سالار حضرت سید سجادؑ سمجھ گئے کہ یہ ہم لوگوں سے واقف نہیں ہے۔ فرمایا کہ اے شیخ کیا تم نے یہ آیت قرآن میں پڑھی ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰي "کہدو اے رسولؐ کہ میں سوائے اپنے اہلبیتؑ کی محبت کے تم سے اس تبلیغ رسالت پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ بوڑھے نے کہا ہاں یہ آیت میں نے پڑھی ہے فرمایا وہ رسولؐ کے اہلبیتؑ ہم ہی ہیں جن کی محبت تم پر فرض ہے۔ یوں ہی خمس والی آیت میں جو ذوی القربیٰ کی لفظ ہے اور آیۂ تطہیر میں اہل بیت کی لفظ ہے سب آپ نے اس کو یاد دلایا۔ بوڑھا یہ سُن کر تھوڑی دیر حیرت سے خاموش رہا پھر کہا کیا خدا کی قسم تم لوگ وہی ہو؟ سید سجادؑ نے فرمایا۔ ہاں قسم بخدا ہم وہی اہلبیتؑ اور قرابت دار رسولؐ کے ہیں یہ سُن کر بوڑھا شیخ رونے لگا عمامہ سر سے پھینک دیا۔ سر آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا "خداوندا گواہ رہنا کہ میں آلِ محمدؐ کے ہر دشمن سے بیزار ہوں"۔ پھر امامؑ سے عرض کیا۔ کیا میری توبہ قبول ہو سکتی ہے؟" فرمایا "ہاں اگر توبہ کرو تو قبول ہوگی اور ہمارے ساتھ ہوگے"۔ اس نے عرض کیا "میں اس جرم سے توبہ کرتا ہوں جو میں نے واقف نہ ہونے کی وجہ سے آپ کی شان میں گستاخی کی"۔

کوفہ میں دربار ابن زیاد میں اور پھر بازار کوفہ میں اور پھر دمشق تک یزید کے سامنے سید سجادؑ اور دیگر اہل حرم کی بیباکانہ گفتگو میں غلبے

اور احتجاج وہ تھے جنھوں نے دنیا کو شہادت حسینؑ کا مقصد بتایا اور اس طرح امام زین العابدینؑ نے اس مشن کو پورا کیا جسے امام حسینؑ انجام دے رہے تھے۔

رہائی کے بعد | قید شام سے رہائی کے بعد امام زین العابدینؑ مع اہل حرم مدینہ گئے اور خاموش زندگی گذارنا شروع کی۔ مگر مدینہ میں اب یزید کی خلافت کے خلاف جذبات بھڑک چکے تھے۔ ان لوگوں نے کوشش کی کہ امام زین العابدینؑ کو اپنے ساتھ شریک کیا جائے مگر امامؑ ان کی نیت اور ان کے ارادوں کی حالت کو خوب جانتے تھے آپ نے ان کا ساتھ دینا منظور نہیں فرمایا۔ اس لئے مدینہ پر جب یزید کی فوج نے چڑھائی کی تو امام زین العابدینؑ کو بلا وجہ کوئی نقصان پہونچانے کی کوشش نہیں کی گئی مگر آپ کے روحانی صدمہ کے لئے یہی کافی تھا کہ رسول اللہؐ کی مسجد میں تین روز تک گھوڑے بندھتے رہے۔ سیکڑوں مسلمان شہید ہوئے اور سیکڑوں شریف عورتوں کی فوج یزید کے ہاتھوں عصمت دری ہوئی یہ مصیبت آپ کے لئے نہایت ناگوار تھی۔ مگر آپ نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ایسے موقع پر جب کہ شہادت حسینؑ سے ہر طرف انقلاب برپا تھا اور مختلف جماعتیں خون حسینؑ کا بدلہ لینے کے لئے کھڑی ہوئی تھیں۔ حضرت امام زین العابدینؑ کا اس ہنگامہ سے الگ رہ کر صرف عبادت اور تعلیمات الٰہی کی اشاعت میں مصروف رہنا ایک بڑا حیرت ناک ضبط نفس کا نمونہ تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سلیمان ابن صرد خزاعی یا مختار ابن ابی عبیدہ ثقفی

جنھوں نے قاتلان حسینؑ سے انتقام لیا۔ امام زین العابدینؑ کے دل میں ان کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ موجود تھا۔ آپ نے مختار کے لئے دعائے خیر فرمائی ہے آپ نے برابر لوگوں سے دریافت فرمایا ہے کہ کون کون قاتل حسینؑ کے قتل ہو گئے۔ یقیناً مختار نے ان قاتلوں کو ان کے جرائم کی سزا دیکر سید سجادؑ کے زخمی دل پر ایک بڑا مرہم لگا دیا مگر آپ کا طرز عمل اتنا غیر متعلق اور محتاط رہا کہ حکومت وقت کی طرف سے کوئی ذمہ داری آپ پر ان اقدامات کی کبھی عائد نہ ہو سکی

آپ کی پوری زندگی کا دور آل محمدؐ اور ان کے شیعوں کے لئے پر آشوب رہا، یزید کے تھوڑے ہی زمانہ کے بعد حجاج ابن یوسف ثقفی کے ظالم حکومت اور چن چن کے آل رسولؐ کے دوستوں کو قتل کرنا، حکومت کی طرف سے ہر ایک نقل و حرکت بلکہ گفتگو پر بھی خفیہ مخبروں کا مقرر ہونا اس صورت میں کہاں ممکن تھا کہ آپ ہدایت خلق کے فرائض کو آزادی کے ساتھ انجام دے سکتے مگر آپ کی خاموش سیرت زندگی ہی دنیا کے لئے بہترین مثال تھی اور اپنی اس خاموش زندگی سے آپ دنیا کو رسول اللہ کی سیرت سے روشناس بنا رہے تھے۔

**مشاغل زندگی** واقعہ کربلا کے بعد ۳۴ برس امام زین العابدینؑ نے انتہائی ناگوار حالات میں بڑے صبر و ضبط اور استقلال سے گذارے اس تمام مدت میں آپ دنیا کے شور و شر سے علٰحدہ صرف دو مشغلوں میں رات دن بسر کرتے تھے۔ ایک عبادت خدا دوسرے اپنے باپ پر گریہ یہی آپ کی مجلسیں تھیں جو زندگی بھر جاری رہیں آپ جتنا اپنے والد بزرگوار کے مصائب کو

یاد کر کے روتے ہیں دنیا میں اتنا کسی نے گریہ نہیں کیا۔ ہر ہر وقت پر آپ کو حسینؑ کی مصیبت یاد آتی تھی۔ جب کھانا سامنے آتا تھا تب روتے تھے جب پانی سامنے آتا تھا تب روتے تھے۔ حسینؑ کی بھوک و پیاس یاد آجاتی تھی تو اکثر اس شدت سے گریہ وزاری فرماتے تھے اور اتنی دیر تک رونے میں مصروف رہتے تھے کہ گھر کے دوسرے لوگ گھبرا جاتے تھے اور انھیں آپ کی زندگی کے لئے خطرہ محسوس ہو جاتا تھا ایک مرتبہ کسی نے پوچھا کہ آخر کب تک روئیے گا تو فرمایا کہ یعقوبؑ نبی کے بارہ بیٹے تھے ایک فرزند غائب ہو گیا تو وہ اس قدر روئے کہ آنکھیں جاتی رہیں میرے سامنے تو اٹھارہ عزیز واقارب جن کا مثل ونظیر دنیا کے پردہ پر نہ تھا قتل ہو گئے ہیں، میں کیسے نہ روؤں۔

یوں تو یہ رونا بالکل فطری تاثرات کی تحریک سے تھا مگر اس کے ضمن میں نہایت پر امن طریقہ سے حسینؑ کی مظلومیت اور شہادت کا تذکرہ زندہ رہا اور زین العابدینؑ کے غیر معمولی گریہ کے چرچے کے ساتھ شہادت حسینؑ کے واقعات کا تذکرہ فطری طور سے لوگوں کی زبانوں پر آتا رہا جو دوسری صورت میں اس وقت حکومت وقت کے مصالح کے خلاف ہونے کی بنا پر ممنوع قرار پا جاتا۔

**دوسری مرتبہ گرفتاری** اتنی پُر امن زندگی کے باوجود حکومت شام کو اپنے مقاصد میں حضرت کی ذات سے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوا اور عبدالملک ابن مروان نے اپنی حکومت کے زمانے میں آپ کو گرفتار کرا کے مدینہ سے شام کی طرف بلوایا اور دو تین دن آپ دمشق میں قید رہے

رہے مگر خدا کی قدرت تھی اور آپ کی روحانیت کا اعجاز جس سے عبدالملک خود پشیمان ہوا اور مجبوراً حضرت کو مدینہ واپس ہو جانے دیا

**اخلاق و کمالات**

پیغمبر خداؐ کی مبارک نسل کی یہ خصوصیت تھی کہ یا وہ فردیں لگاتار ایک ہی طرح کے انسانی کمالات اور بہترین اخلاق و اوصاف کی حامل ہوتی رہیں جن میں سے ہر ایک اپنے وقت میں نوع انسانی کے لئے بہترین نمونہ تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ کی چوتھی کڑی سید سجادؑ تھے جو اخلاق و اوصاف میں اپنے بزرگوں کے یادگار تھے اگر ایک طرف صبر و برداشت کا جوہر وہ تھا جو کربلا کے آئینہ میں نظر آیا تو دوسری طرف حلم اور عفو کی صفت آپ کی انتہا درجہ پر تھی۔ آپ نے ان موقعوں پر اپنے خلاف سخت کلامی کرنے والوں سے جس طرح کی گفتگو فرمائی ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ کا علم اس طرح کا نہ تھا جیسے کوئی کمزور نفس والا انسان ڈر کر یا اپنے کو مجبور سمجھ کر تحمل سے کام لے بلکہ آپ عفو اور درگذر کی فضیلت پر زور دیتے ہوئے اپنے عمل سے اس کی مثال پیش کرتے تھے۔ ایک شخص نے بڑی سخت کلامی کی اور بہت سے غلط الزامات آپ پر آپ کے منہ پر عائد کئے حضرت نے فرمایا جو کچھ تم نے کہا اگر وہ صحیح ہے تو خدا مجھے معاف کرے اور اگر غلط ہے ...... تو خدا تمہیں معاف کرے۔ اس بلند اخلاقی کے مظاہرے کا ایسا اثر پڑا کہ خطاوار نے سر جھکا دیا اور کہا حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کہا وہ غلط ہی تھا ایسے ہی دوسرے موقع پر ایک شخص نے آپ کی شان میں بہت ہی نازیبا کوئی لفظ استعمال کی حضرت نے اس طرح بے توجہی فرمائی کہ جیسے سنا ہی نہیں۔ اس نے پکار کے کہا

اِیَّاكِ اَعْنِیْ " یعنی میں آپ کو کہہ رہا ہوں۔ حضرت نے فرمایا وَعَنْكِ اُعْرِضُ
ان میں تم ہی سے اعراض یعنی بے توجہی کر رہا ہوں یہ اشارہ تھا اس حکم قرآن
کی طرف کہ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِیْنَ یعنی عفو
کو اختیار کرو، اچھے کاموں کی ہدایت کرو اور جاہلوں سے بے توجہی اختیار کرو

ہشام ابن اسماعیل ایک شخص تھا جس سے حضرت کی نسبت کچھ ناگوار باتیں
سرزد ہوئی تھیں یہ خبر بنی امیہ کے (نیک) بادشاہ عمر ابن عبدالعزیز کو پہونچی اس نے
حضرت کو لکھا کہ میں اس شخص کو سزا دوں گا آپ نے فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ
میری وجہ سے اس کو کوئی نقصان پہونچے

فیاضی اور خدمت خلق کا جذبہ آپ کا ایسا تھا کہ راتوں کو غلہ اور
روٹیاں اپنی پشت پر رکھ کے غریبوں کے گھروں پر لے جاتے تھے اور تقسیم کرتے
تھے بہت سے لوگوں کو خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ وہ کہاں سے پاتے ہیں اور کون ان
تک پہونچاتا ہے جب حضرت کی وفات ہوئی اس وقت انھیں پتہ چلا کہ یہ امام
زین العابدینؑ تھے عمل کی ان خوبیوں کے ساتھ علمی کمال بھی آپ کا ایسا تھا جو
دشمنوں کو بھی سر جھکانے پر مجبور کرتا تھا اور ان کو اقرار تھا کہ آپ کے زمانے
میں فقہ اور علم دین کا کوئی عالم آپ سے بڑھ کر نہیں ان تمام ذاتی بلندیوں
کے ساتھ آپ دنیا کو یہ سبق بھی دیتے تھے کہ بلند خاندان سے ہونے پر ناز نہیں
کرنا چاہیے۔ یہاں تک کہ آپ جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے
تو اپنا نام و نسب لوگوں کو نہ بتلاتے تھے کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا
مجھے یہ اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ میں اپنے نسب کا سلسلہ پیغمبرؐ خدا تک ملاؤں

اور ان کے صفات مجھ میں نہ پائے جائیں۔

**عبادت** آپ کی مخصوص صفت جس سے آپ زین العابدینؑ اور سید الساجدینؑ مشہور ہوئے وہ عبادت ہے۔ باوجودیکہ آپ کربلا کے ایسے ہو حادثے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ باپ بھائیوں اور عزیزوں کے دردناک قتل کے مناظر برابر آپ کی آنکھوں میں پھرا کرتے تھے اس حالت میں کسی دوسرے خیال کا ذہن پر غالب آنا عام انسانی فطرت کے لحاظ سے بہت مشکل ہے۔ مگر باپ کے اس غم و صدمہ پر جس نے عمر بھر سید سجادؑ کو رلایا اگر کوئی چیز غالب آئی تو وہ خوف خدا اور عبادت میں محویت تھی۔ یہاں تک کہ جس وقت وضو کے لئے پانی سامنے آتا تھا اور نماز کا ارادہ فرماتے تھے اس وقت آپ کے تصورات کی دنیا بدل جاتی تھی چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا اور جسم میں لرزہ پڑ جاتا تھا کوئی سبب پوچھتا تھا تو فرماتے تھے کہ خیال تو مجھے کس حقیقی سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا ہے۔

ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر ایسا ہوا کہ احرام باندھتے وقت لبیک (حاضر ہوں) کہنا چاہا تو رنگ چہرہ کا اڑ گیا اور تمام جسم میں لرزہ پڑ گیا اور کسی طرح لبیک نہ کہا گیا لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا میں سوچتا ہوں کہ شاید میں لبیک کہوں اور اس بارگاہ سے یہ آواز آئے کہ لا لبیک (حاضری کی اجازت نہیں) یہ فرما کر اتنا روئے کہ غش آ گیا اس دور میں کہ جب دنیا کے دل پر بادشاہوں کی عظمت کا اثر تھا اور خالق کو بالکل بھول چکی تھی سید سجاد ہی تھے جن کی زندگی خالق کی عظمت کا احساس پیدا کرتی تھی۔

**صحیفۂ سجادیہ یا زبور آل محمدؐ** حضرت امام زین العابدینؑ کو زمانہ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اپنے دادا علی ابن ابی طالبؑ کی طرح خطبوں و تقریروں کے ذریعہ سے دنیا کو علوم و معارف اور الٰہیات وغیرہ کی تعلیم دیں۔ و ان کے لئے اس کا موقع تھا کہ وہ اپنے بیٹے امام محمد باقرؑ یا اپنے پوتے امام جعفر صادقؑ کی طرح شاگردوں کے مجمع میں علمی و دینی مسائل حل کریں اور دنیا کو اچھی باتوں کی تعلیم دیں یہ سب باتیں وہ تھیں جو اس وقت کی فضا کے لحاظ سے غیر ممکن تھیں۔

اس لئے امام زین العابدینؑ نے ایک تیسرا طریقہ اختیار کیا جو بالکل پر امن تھا اور روکنے کا دنیا کی کسی طاقت کو کوئی بہانہ نہیں مل سکتا تھا وہ یہ تھا کہ تمام دنیا والوں کے منہ موڑ کر وہ اپنے خالق سے مناجات کرتے اور دعائیں پڑھتے تھے مگر یہ مناجاتیں اور دعائیں کیا تھیں؟ الٰہیات کا خزانہ، معارف و حقائق کا گنجینہ، خالق اور مخلوق کے باہمی تعلق کا صحیح آئینہ ان دعاؤں کا مجموعہ صحیفۂ کاملہ صحیفۂ سجادیہ اور زبور آل محمدؐ کے ناموں سے اس وقت تک موجود ہے

اس میں انسان کو وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو لمبے لمبے خطبوں اور تقریروں میں فائدہ اتنی پر تاثیر انداز سے نہ ملتا۔

**وفات** افسوس ہے کہ حضرت امام زین العابدینؑ کی یہ خاموش زندگی بھی ظالم حکومت کو ناگوار ہوئی اور ولید بن عبدالملک اموی بادشاہ شام نے آپ کو زہر دلوا دیا اور ۲۵ محرم ۹۵ھ شہر مدینہ میں وفات ہوئی امام محمد باقرؑ نے اپنے مقدس باپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور جنت البقیع میں حضرت امام حسنؑ کے پہلو میں دفن کیا

# پانچویں امام

## حضرت امام محمد باقر علیہ السلام

**نام ونسب**

آپ کا نام اپنے جد بزرگوار حضرت رسولخدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر محمدؐ تھا اور باقر لقب۔ اسی سے امام محمد باقر کے نام سے مشہور ہوئے بارہ اماموں میں سے یہ آپ ہی کو خصوصیت تھی کہ آپ کا سلسلہ نسب ماں اور باپ دونوں طرف سے حضرت رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچتا ہے۔ دادا آپ کے سید الشہداء حضرت امام حسین علیہ السلام تھے جو حضرت رسولخدا محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ کے چھوٹے نواسے تھے اور والدہ آپ کی ام عبد اللہ فاطمہ حضرت امام حسن علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں جو حضرت رسول کے بڑے نواسے تھے اسطرح حضرت امام محمد باقر علیہ السلام رسولؐ کے بلند کمالات اور علیؑ و فاطمہؑ کی نسل کے پاک خصوصیات کے ماں باپ دونوں کی جانب کے وارث

**ولادت**

آپ کی ولادت روز جمعہ یکم رجب ۵۷ھ میں ہوئی۔ وہ وقت تھا جب امام حسن علیہ السلام کی وفات کو سات برس ہو چکے تھے امام حسین علیہ السلام مدینہ میں خاموشی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور زمانہ کی رفتار تیزی کے ساتھ واقعہ کربلا کے اسباب کو فراہم کر رہی تھی زمانہ اہلبیت اور شیعیان اہلبیت کے لئے پرآشوب تھا چن چن کر محبان علیؑ گرفتار کئے جا

تھے، تلوار کے گھاٹ اتارے جارہے تھے یا سولیوں پر چڑھائے جارہے تھے اس وقت اس مولود کی ولادت گویا کربلا کے جہاد میں شریک ہونیوالے سلسلہ میں ایک کڑی کی تکمیل تھی۔

**واقعہ کربلا** تین برس محمد باقر علیہ السّلام اپنے جد بزرگوار حضرت امام حسین کے سایہ میں رہے جب آپ کا سن پورے تین برس کا ہوا تو امام حسین علیہ السّلام نے مدینہ سے سفر کیا۔ اس کم سنی میں محمد باقر بھی راستہ کی تکلیفیں سہنے میں اپنے بزرگوں کے شریک رہے امام حسین علیہ السلام نے مکہ میں پناہ لی پھر کوفہ کا سفر اختیار کیا اور پھر کربلا پہونچے۔ ساتویں محرم سے جب پانی بند ہو گیا تو یقیناً محمد باقر نے بھی تین دن پیاس کی تکلیف برداشت کی۔ یہ خالق کے منشا کی ایک تکمیل تھی کہ وہ روز عاشور میدان قربانی میں نہیں لائے گئے ورنہ جب ان سے چھوٹے سن کا بچہ علی اصغر تیرِ ستم کا نشانہ ہو سکتا تھا تو محمد باقر کا بھی قربان گاہ شہادت میں لانا ممکن تھا مگر سلسلہ امامت کا دنیا میں قائم رہنا نظام کائنات کے برقرار رہنے کے لئے ضروری اور اہم تھا لہذا منظورِ الٰہی یہ تھا کہ محمد باقر کربلا کے جہاد میں اسی طرح شریک ہوں جس طرح ان کے والد بزرگوار سید سجاد زین العابدین علیہ السلام شریک ہوئے عاشور کو دن بھر عزیزوں کے لاشے پر لاشے آتے دیکھنا۔ بی بیوں میں کہرام بچوں میں تہلکہ، امام حسین کا وداع ہونا اور ننھی سی جان علی اصغر تک کا جھولے سے جدا ہو کر میدان میں جانا اور پھر واپس نہ آنا امام کے باوفا گھوڑے کا در خیمہ پر خالی

زمین کے ساتھ آنا اور پھر خیمہ عصمت میں ایک قیامت کا برپا ہونا یہ سب مناظر محمد باقرؑ کی آنکھوں کے سامنے آئے اور پھر بعد عصر خیموں میں آگ کا لگنا اسباب کا لوٹا جانا بیبیوں کے سروں سے چادروں کا اتارا جانا اور آگ کے شعلوں سے بچوں کا گھبرا کر سراسیمہ و مضطرب ادھر ادھر پھرنا اس عالم میں محمد باقرؑ کے ننھے سے دل پر کیا گذری اور کیا تاثرات ان کے دل پر قائم رہ گئے اس کا اندازہ کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔

گیارہ محرم کے بعد ماں اور پھوپھی دادی اور نانی اور تمام خاندان کے بزرگوں کو دشمنوں کی قید میں اسیر دیکھا۔ یقیناً اگر سکینہؑ کا بازو رسی میں بندھ سکتا تھا تو یقین کیا جا سکتا ہے کہ محمد باقرؑ کا گلا بھی رسیاں ظلم سے ضرور باندھا گیا۔ کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام اور پھر رہائی کے بعد مدینہ کی واپسی ان تمام منازل میں نہ جانے کتنے صدمے تھے جو محمد باقرؑ کے ننھے سے دل کو اٹھانا پڑے اور کتنے غم و الم کے نقش تھے جو دل پر ایسے بیٹھے کہ آئندہ زندگی میں ہمیشہ برقرار رہے۔

**تربیت** واقعہ کربلا کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام کی زندگی دنیا کی کشمکشوں اور آویزشوں سے بالکل الگ نہایت سکون اور سکوت کی زندگی تھی۔ اہل دنیا سے میل جول بالکل ترک کبھی محراب عبادت اور کبھی باپ کا ماتم انہی دو مشغلوں میں تمام اوقات صرف ہوتے تھے یہی زمانہ وہ تھا جس میں امام محمد باقرؑ نے نشوونما پائی سنہ ۶۱ھ سے سنہ ۹۵ھ تک ۳۴ برس اپنے مقدس باپ کی سیرت زندگی کا مطالعہ کرتے رہے اور اپنے فطری

اور خدا داد ذاتی کمالات کے ساتھ ان تعلیمات سے فائدہ اٹھاتے رہے جو انھیں اپنے والد بزرگوار کی زندگی کے آئینہ میں برابر نظر آتی رہیں۔

## باپ کی وفات اور امامت کی ذمہ داریاں

حضرت امام محمد باقرؑ بھرپور جوانی کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے ایک ساتھ جسمانی و روحانی کمال کے بلند ترین نقطہ پر تھے اور ۳۰ برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؑ علیہ السلام کی وفات ہوئی حضرت نے اپنے وقت وفات ایک صندوق جس میں اہل بیتؑ کے مخصوص علوم کی کتابیں تھیں امام محمد باقرؑ کے سپرد کیا۔ نیز اپنی تمام اولاد کو جمع کر کے ان سب کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری اپنے فرزند محمد باقرؑ پر قرار دی اور ضروری وصایا فرمائے اس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں حضرت امام محمد باقرؑ پر آئیں آپ سلسلہ اہل بیتؑ کے پانچویں امام ہوئے جو رسولؐ خدا کے برحق جانشین تھے۔

## اس دور کے خصوصیات

یہ زمانہ وہ تھا جب بنی امیہ کی سلطنت اپنی مادی طاقت کے لحاظ سے بڑھاپے کی منزلوں سے گذر رہی تھی بنی ہاشم پر ظلم و ستم اور خصوصاً کربلا کے واقعے نے بہت حد تک دنیا کی آنکھوں کو کھول دیا تھا اور جب یزید خود اپنے مختصر زمانۂ حیات ہی میں جو واقعہ کربلا کے بعد ہوا اپنے کیے پر پشیمان ہو چکا تھا اور اس کے بُرے نتائج کو محسوس کر چکا تھا اور اس کے بعد اس کا بیٹا معاویہ اپنے باپ اور دادا کے افعال سے کھلم کھلا اظہار بیزاری کر کے سلطنت سے دست بردار

ہوگیا تھا تو بعد کے سلاطین کو کہاں تک ان مظالم کے مہلک نتائج کا
احساس نہ ہوتا جبکہ اس وقت جماعت توابین کا جہاد، مختار اور ان کے
ہمراہیوں کے خون حسینؑ کا بدلہ لینے میں اقدامات اور نہ جانے کتنے واقعات
سامنے آچکے تھے جن سے سلطنت شام کی بنیادیں ہل گئی تھیں اس کا نتیجہ تھا
کہ امام محمد باقر علیہ السّلام کے زمانہ امامت کو حکومت کے ظلم و تشدد کی گرفت
سے کچھ آزادی نصیب ہوئی اور آپ کو خلق خدا کی اصلاح و ہدایت کا کچھ
زیادہ موقع مل سکا۔

**عزائے امام حسینؑ میں انہماک** آپ واقعہ کربلا کو اپنی آنکھ سے
دیکھے ہوئے تھے پھر اپنے باپ کی تمام زندگی کا جو امام مظلومؑ کے غم میں رونے
میں بسر ہوئی مطالعہ کر چکے تھے یہ احساس بھی نہایت تکلیف دہ تھا کہ ان کے
والد بزرگوار باوجود اتنے غم و رنج اور گریہ و زاری کے ایسا موقع نہ پاسکے
کہ دوسروں کو امام حسین علیہ السّلام کا ماتم برپا کرنے کی دعوت دیتے اس کا
نتیجہ تھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو اس میں خاص اہتمام پیدا ہوا۔ آپ
مجالس کی بنا فرماتے تھے اور کمیت بن زید اسدی جو آپ کے زمانہ کے بڑے
شاعر تھے ان کو بلا کر مراثی امام حسین علیہ السّلام پڑھواتے اور سنتے تھے۔ یہی
وہ ابتدا تھی جسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السّلام اور اس کے بعد
پھر امام رضا علیہ السّلام کے زمانہ میں بہت فروغ حاصل
ہوا۔

**علمی مرجعیت** دریا کا پانی بند کے باندھ دیئے جانے سے جب کچھ

عرصہ تک ٹھہر جائے اور پھر کسی وجہ سے وہ بند ٹوٹے تو پانی بڑی قوت اور جوش و خروش کے ساتھ بہتا ہوا محسوس ہوگا۔ ائمہ اہلبیتؑ میں سے ہر ایک کے سینہ میں ایک ہی دریا تھا علم کا جو موجزن تھا مگر اکثر اوقات ظلم و تشدد کی وجہ سے اس دریا کو پیاسوں کے سیراب کرنے کے لئے بہنے کا موقع نہیں دیا گیا امام محمد باقرؑ کے زمانہ میں جب تشدد کا شکنجہ ذرا ڈھیلا ہوا تو علوم اہلبیتؑ کا دریا پوری طاقت کے ساتھ امڈا اور ہزاروں پیاسوں کو سیراب کرتا ہوا شریعت حقہ اور احکام الٰہی کی کھیتیوں کو سرسبز بناتا ہوا دنیا میں پھیل گیا۔ اس علمی تبحر اور وسعت معلومات کے مظاہرے کے نتیجے میں آپ کا لقب باقرؑ مشہور ہوا۔ اس لفظ کے معنی ہیں "اندرونی باتوں کے ظاہر کرنے والے" چونکہ آپ نے اپنے علم سے بہت سے پوشیدہ مطالب کو ظاہر کیا اس لئے تمام مسلمان آپ کو باقرؑ کے نام سے یاد کرنے لگے آپ سے علوم اہلبیتؑ حاصل کرنے والوں کی تعداد سیکڑوں تک پہونچی ہوئی تھی۔ بہت سے ایسے افراد بھی جو عقیدتاً ائمہ معصومینؑ سے وابستہ نہ تھے اور جنھیں جماعت اہلسنت اپنے محدثین میں بلند درجہ پر سمجھتی ہے وہ بھی علمی فیوض حاصل کرنے امام محمد باقر علیہ السّلام کی ڈیوڑھی پر آتے تھے جیسے زہری۔ امام اوزاعی اور عطار بن جریح۔ قاضی حفص بن غیاث وغیرہ یہ سب امام محمد باقرؑ کے شاگردوں میں محسوب ہیں۔

## علوم اہل بیتؑ کی اشاعت

حضرت کے زمانہ میں علوم اہلبیت کے تحفظ کا اہتمام ہوا اور حضرت کے

شاگردوں نے ان افادات سے جو انھیں حضرت امام محمد باقرؑ سے حاصل ہوئے مختلف علوم و فنون اور مذہبا کے شعبوں میں کتابیں تصنیف کیں۔ ذیل میں حضرت کے کچھ شاگردوں کا ذکر اور ان کے تصانیف کا نام درج کیا جاتا ہے جس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ امام محمد باقر علیہ السّلام سے اسلامی دنیا میں علم و ادب نے کتنی ترقی کی۔

(۱) ابان ابن تغلب۔ یہ علم قرأت اور لغت کے امام مانے گئے ہیں۔ سب سے پہلے کتاب غریب القرآن یعنی قرآن مجید کے مشکل الفاظ کی تشریح انھوں نے تحریر کی تھی اور ۱۴۱ھ میں وفات پائی۔

(۲) ابو جعفر محمد ابن حسن ابن ابی سارہ رواسی۔ علم قرأت، نحو اور تفسیر کے مشہور عالم تھے۔ کتاب الفیصل معانی القرآن وغیرہ پانچ کتابوں کے مصنف ہیں ۱۰۳ھ میں وفات پائی

(۳) عبداللہ ابن میمون اسود القداح۔ ان کے تصانیف سے ایک کتاب بعثت نبی رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور تاریخ زندگی میں اور ایک کتاب حالات جنت و نار میں تھی ۱۰۵ھ میں وفات پائی۔

(۴) عطیہ ابن سعید عوفی۔ پانچ جلدوں میں تفسیر قرآن لکھی ۱۱۱ھ میں وفات پائی۔

(۵) اسماعیل ابن عبدالرحمٰن السدی الکبیر۔ یہ مشہور مفسر قرآن ہیں جن کے حوالے تمام اسلامی مفسرین نے سدی کے نام سے دیے ہیں۔

سنہ ۱۲۷ھ میں وفات پائی۔

(۶) جابر بن یزید جعفی۔ انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے پچاس ہزار حدیثیں سنکر یاد کیں اور ایک روایت میں ستّر ہزار کی تعداد بتائی گئی ہے اس کا ذکر صحاح ستہ میں سے صحیح مسلم میں موجود ہے۔ تفسیر۔ فقہ اور حدیث میں کئی کتابیں تصنیف کیں سنہ ۱۲۸ھ میں وفات پائی

(۷) عمار بن معاویہ دہنی فقہ میں ایک کتاب تصنیف کی سنہ ۱۳۳ھ میں وفات پائی۔

(۸) سالم بن ابی حفصہ ابو یونس کوفی۔ فقہ میں ایک کتاب لکھی۔ وفات سنہ ۱۳۷ھ

(۹) عبد المومن بن قاسم ابو عبد اللہ انصاری۔ یہ بھی فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ سنہ ۱۴۷ھ میں وفات پائی۔

(۱۰) ابو حمزہ ثمالی۔ تفسیر قرآن میں ایک کتاب لکھی۔ اس کے علاوہ کتاب النوادر اور کتاب الزہد بھی ان کے تصانیف میں سے ہیں۔ سنہ ۱۵۰ھ میں وفات پائی۔

(۱۱) زرارہ ابن اعین بڑے بزرگ مرتبہ شیعہ عالم تھے ان کی علم کلام اور فقہ اور حدیث میں بہت سی کتابیں ہیں۔ وفات سنہ ۱۵۰ھ

(۱۲) محمد بن مسلم۔ یہ بھی بڑے بلند پایہ بزرگ تھے۔ امام محمد باقر علیہ السلام سے تیس ہزار حدیثیں سنیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے ایک کتاب تھی چہار صد مسئلہ در ابواب حلال و حرام۔ وفات سنہ ۱۵۰ھ۔

(۱۳) یحییٰ بن قاسم ابو بصیر اسدی جلیل المرتبہ بزرگ تھے کتاب مناسک حج

کتاب یوم ولیلہ تصنیف کی ۔ ۲۵۰ھ میں وفات پائی ۔

(۱۴) اسحٰق قمی ۔ فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں

(۱۵) اسماعیل بن جابر خثعمی کوفی احادیث کی کئی کتابیں تصنیف کیں اور ایک کتاب فقہ میں تصنیف کی

(۱۶) اسمٰعیل بن عبد الخالق ۔ بلند مرتبہ فقیہ تھے ، ان کی تصنیف سے بھی ایک کتاب تھی

(۱۷) برد الاسکاف الازدی ۔ فقہ میں ایک کتاب لکھی

(۱۸) حارث بن مغیرہ ۔ یہ بھی مسائل فقہ میں ایک کتاب کے مصنف ہیں

(۱۹) حذیفہ بن منصور خزاعی ۔ ان کی بھی ایک کتاب فقہ میں تھی

(۲۰) حسن بن السری الکاتب ۔ ایک کتاب تصنیف کی

(۲۱) حسین بن ثور ابن ابی فاختہ ۔ کتاب النوادر تحریر کی

(۲۲) حسین بن حماد عبدی کوفی ۔ ایک کتاب کے مصنف ہیں

(۲۳) حسین بن مصعب بجلی ۔ ان کی بھی ایک کتاب تھی ۔

(۲۴) حماد بن ابی طلحہ ۔ ایک کتاب تحریر کی

(۲۵) حمزہ بن حمران بن اعین ۔ زرارہ کے بھتیجے تھے اور ایک کتاب کے مصنف تھے ۔

یہ چند نام ہیں ان کثیر علماء و فقہاء و محدثین میں سے جنہوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے علوم اہلبیت کو حاصل کر کے کتابوں کی صورت میں محفوظ کیا ۔ یہ اور پھر اس کے بعد امام جعفر صادق علیہ السلام کے دور میں

جو سیکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں یہی وہ سرمایہ تھا جس سے بعد میں کافی۔ من لایحضر۔ تہذیب اور استبصار ایسے بڑے حدیث کے خزانے جمع ہو سکے اور جن پر شیعت کا آسمان دورہ کرتا رہا ہے۔

**اخلاق و اوصاف** آپ کے اخلاق وہ تھے کہ دشمن بھی قائل تھے۔ چنانچہ ایک شخص اہل شام میں سے مدینہ میں قیام رکھتا تھا اور اکثر امام محمد باقر علیہ السلام کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا اس کا بیان تھا کہ مجھے اس گھرانے سے ہرگز کوئی خلوص و محبت نہیں مگر آپ کے اخلاق کی کشش اور فصاحت وہ ہے جس کی وجہ سے میں آپ کے پاس آنے اور بیٹھنے پر مجبور رہوں۔

**امور سلطنت میں مشورہ** سلطنت اسلامیہ حقیقت میں اہلبیت رسولؐ کا حق تھی مگر دنیا والوں نے مادی اقتدار کے آگے سر جھکایا اور ان حضرات کو گوشہ نشینی اختیار فرمانا پڑی۔ عام افراد انسانی کی ذہنیت کے مطابق اس صورت میں اگر حکومت وقت کسی وقت ان حضرات کی امداد کی ضرورت محسوس کرتی تو صاف طور پر انکار میں جواب دیا جا سکتا تھا۔ مگر ان حضرات کے پیش نظر عالی ظرفی کا وہ معیار تھا جس تک عام لوگ پہونچے ہوئے نہیں ہوتے۔ جس طرح امیر المومنین حضرت علی ابن طالب علیہ السلام نے سخت موقعوں پر حکومت وقت کو مفید مشورے دینے سے دریغ نہیں کیا اسی طرح اس سلسلہ کے تمام حضرات نے اپنے اپنے زمانے کے بادشاہوں کے ساتھ یہی طرز عمل اختیار کیا چنانچہ حضرت امام محمد باقرؑ

کے زمانہ میں بھی ایسی صورت پیش آئی۔ واقعہ یہ تھا کہ حکومت اسلام کی طرف سے اس وقت تک کوئی خاص سکہ نہیں بنایا گیا تھا بلکہ رومی سلطنت کے سکّے اسلامی ممالک میں بھی رائج تھے۔ ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں سلطنت شام اور سلطان روم کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا۔ رومی سلطنت نے یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے سکوں پر پیغمبر اسلام کی شان کے خلاف کچھ الفاظ نقش کرادے گی۔ اس سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پیدا ہوگئی۔ ولید نے ایک بہت بڑا جلسہ مشاورت کے لئے منعقد کیا جس میں عالم اسلام کے ممتاز افراد شریک تھے اس جلسہ میں امام محمد باقر علیہ السّلام بھی شریک ہوئے اور آپ نے یہ رائے دی کہ مسلمانوں کو خود اپنا سکہ ڈھالنا چاہئے جس میں ایک طرف لا الہ الا اللہ اور دوسری طرف محمد رسول اللہ نقش ہو۔ امامؑ کی اس تجویز کے سامنے سر تسلیم خم کیا گیا اور اسلامی سکہ اسی طور پر تیار کیا گیا۔

## سلطنت بنی امیہ کی طرف سے مزاحمت

باوجودیکہ امام محمد باقرؑ معاملات ملکی میں کوئی دخل نہ دیتے تھے اور دخل دیا بھی تو سلطنت کی خواہش پر وقار اسلامی کے برقرار رکھنے کے لئے مگر آپ کی خاموش زندگی اور خالص علمی اور روحانی مرجعیت بھی سلطنت وقت کو گوارا نہ تھی چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے مدینہ کے حاکم کو خط لکھا کہ امام محمد باقر علیہ السلام کو ان کے فرزند حضرت جعفر صادقؑ کے ساتھ دمشق بھیج دیا جائے اس کو منظور یہ تھا کہ حضرت کی عزت و وقار کو اپنے خیال میں

دمشق بلا بھیجا۔ چنانچہ جب حضرت دمشق پہونچے تو تین دن تک ہشام نے ملاقات کا موقع نہیں دیا۔ چوتھے دن دربار میں بلا بھیجا ایک ایسے موقع پر کہ جب وہ تخت شاہی پر بیٹھا تھا اور لشکر داہنے اور بائیں ہتھیار لگائے صف بستہ کھڑا ہوا تھا اور وسط دربار میں ایک نشانہ تیر اندازی کا مقرر کیا گیا تھا اور روسائے سلطنت اس کے سامنے شرط باندھ کر تیر لگاتے تھے۔ امام علیہ السلام کے پہونچنے پر انتہائی جرأت اور جسارت کے ساتھ اس نے خواہش کی کہ آپ بھی ان لوگوں کے ہمراہ تیر لگائیں۔ ہر چند حضرت نے معذرت فرمائی مگر اس نے قبول نہ کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ آل محمدؐ طویل مدّت سے گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کو جنگ کے فنون سے کیا واسطہ اور اس طرح منظور یہ تھا کہ لوگوں کو ہنسنے کا موقعہ ملے مگر وہ یہ نہ جانتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک فرد کے بازو میں علیؑ کی قوت اور دل میں امام حسینؑ کی طاقت موجود ہے وہ حکم الٰہی اور فرض کا احساس ہے جس کی وجہ سے یہ حضرات ایک سکون اور سکوت کا مجسمہ نظر آتے ہیں۔ یہی ہوا کہ جب مجبور ہو کر حضرت نے تیر و کمان ہاتھ میں لیا اور چند تیر پے درپے ایک ہی نشانے پر بالکل ایک ہی نقطہ پر لگائے تو مجمع تعجب اور حیرت میں غرق ہو گیا اور ہر طرف سے تعریفیں ہونے لگیں۔ ہشام کو اپنے طرز عمل پر پشیمان ہونا پڑا۔ اس کے بعد حضرت سے مسئلہ امامت اور فضائل اہلبیتؑ پر گفتگو ہوئی جس کے بعد اس کو یہ احساس ہوا کہ امام علیہ السلام کا دمشق میں قیام کہیں عام خلقت کے دل میں اہلبیت کی عظمت قائم کر دینے کا سبب نہ ہو اس لئے اس نے آپ کو واپس مدینہ جانے کی اجازت دیدی مگر دل میں حضرت کے ساتھ عداوت میں

اور اضافہ ہو گیا۔

**وفات** سلطنت شام کو جتنا حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی جلالت اور بزرگی کا اندازہ زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی آپ کا وجود ان کے لیے ناقابل برداشت محسوس ہوتا رہا۔ آخر آپ کو اُس خاموش زہر کے حربے سے جو اکثر سلطنت بنی امیہ کی طرف سے کام میں لایا جا رہا تھا۔ شہید کرنے کی تدبیر کر لی گئی۔ وہ ایک زین کا تحفہ تھا جس میں خاص تدبیروں سے زہر پوشیدہ کیا گیا تھا اور جب حضرت اس زین پر سوار ہوئے تو زہر جسم میں سرایت کر گیا چند روز کرب و تکلیف میں بستر بیماری پر گذرے اور آخر سات ذی الحجہ ۱۱۴ھ کو ۵۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔

آپ کو حسب وصیت تین کپڑوں کا کفن دیا گیا جن میں سے ایک وہ یمنی چادر تھی جسے اوڑھ کر آپ روز جمعہ نماز پڑھتے تھے اور ایک وہ پیراہن تھا جسے آپ ہمیشہ پہنے رہتے تھے اور جنت البقیع میں اسی قبہ میں کہ جہاں حضرت امام حسنؑ اور امام زین العابدینؑ دفن ہو چکے تھے حضرت بھی دفن کئے گئے۔

# چھٹے امام

## حضرت صادق آل محمد علیہ السلام

**نام ونسب** جعفرؑ نام کنیت ابو عبداللہ اور صادق لقب تھا۔ آپ حضرت امام محمد باقرؑ کے بیٹے حضرت امام زین العابدینؑ کے پوتے اور شہید کربلا حضرت امام حسین علیہ السلام کے پردوتے تھے۔ سلسلہ عصمت کی آٹھویں کڑی اور ائمہ اہلبیتؑ میں سے چھٹے امام تھے آپ کی والدہ حضرت محمد ابن ابی بکر کی پوتی ام فروہ تھیں جن کے والد قاسم ابن محمد مدینہ کے سات مشہور فقہا میں سے تھے۔

**ولادت** ۸۳ھ میں ۱۷ ربیع الاول کو اپنے جد بزرگوار رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کی تاریخ میں آپ کی ولادت ہوئی اس وقت آپ کے دادا حضرت امام زین العابدینؑ بھی زندہ تھے آپ کے والد بزرگوار حضرت امام محمد باقرؑ کی عمر اس وقت چھبیس برس کی تھی۔ خاندان آل رسولؐ میں اس اضافہ کا انتہائی خوشی سے استقبال کیا گیا۔

**نشوونما اور تربیت** بارہ برس آپ نے اپنے جد بزرگوار حضرت امام زین العابدینؑ کے زیر سایہ تربیت پائی شہادت امام حسینؑ کے بعد سے

پینتیس ۳۵ برس امام زین العابدین علیہ السّلام کا شغل عبادت الٰہی اور اپنے مظلوم باپ حضرت سید الشہداء کو روتے کے سوا اور کچھ نہ تھا واقعہ کربلا کو ابھی صرف بائیس ۲۲ برس گذرے تھے۔ اس مدت میں کربلا کا عظیم الشان واقعہ اپنے اثرات کے لحاظ سے ابھی کل ہی کی بات معلوم ہوتا تھا۔ امام جعفر صادقؑ نے آنکھ کھولی تو اسی غم و اندوہ کی فضا میں شب و روز شہادت حسینؑ کا تذکرہ اور اس غم میں نوحہ و ماتم اور گریہ و بکا کی آوازوں نے ان کے دل و دماغ پر وہ اثر قائم کیا کہ جیسے وہ خود واقعہ کربلا میں موجود ہوتے پھر جب وہ یہ سنتے تھے کہ ان کے والد بزرگوار امام محمد باقرؑ بھی کم سنی ہی کے عالم میں سہی اس جہاد میں شریک تھے تو ان کے دل کو یہ احساس بہت صدمہ پہنچاتا ہوگا کہ خاندان عصمت کے موجودہ افراد میں ایک میں ہی ہوں جو اس قابل فخر یادگار معرکہ ابتلا میں موجود نہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد ہمیشہ اور عمر بھر امام جعفر صادق علیہ السلام نے جس طرح اپنے جد مظلوم امام حسینؑ کی یاد کو قائم رکھنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے۔

بارہ برس کی آپ کی عمر تھی جب ۹۵ھ میں امام زین العابدین علیہ السلام کا سایہ سر سے اٹھا۔ اس کے بعد انیس ۱۹ برس آپ نے اپنے والد ماجد حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے دامان تربیت میں گذارے۔ یہ وہ وقت تھا جب سیاست بنی امیہ کی بنیادیں ہل چکی تھیں اور امام محمد باقرؑ کی طرف فیوض علمی حاصل کرنے کے لئے خلائق رجوع کر رہی تھی اس وقت اپنے پدر بزرگوار کی مجلس درس میں حضرت جعفر صادقؑ ہی ایک وہ طالب علم تھے

جو قدرت کی طرف سے علم کے سانچے میں ڈھال کر پیدا کئے گئے تھے۔ آپ سفر اور حضر دونوں میں اپنے والد بزرگوار کے ساتھ رہتے تھے۔ چنانچہ ہشام ابن عبد الملک کی طلب پر حضرت امام محمد باقر علیہ السلام جب دمشق تشریف لے گئے ہیں تو اس سفر میں بھی امام جعفر صادق علیہ السلام ساتھ تھے اس کا ذکر پانچویں امام کے حالات میں ہو چکا ہے۔

**دورِ امامت**

۱۱۴ھ میں حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی وفات ہو گئی اب امامت کی ذمہ داریاں امام جعفر صادق علیہ السلام کی طرف عائد ہوئیں اس وقت دمشق میں ہشام بن عبد الملک کی سلطنت تھی۔ اس کے زمانہ سلطنت میں ملک میں سیاسی خلفشار بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ مظالم بنی امیہ کے انتقام کا جذبہ تیز ہو رہا تھا۔ اور بنی فاطمہ میں سے متعدد افراد حکومت کے مقابلے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ ان میں نمایاں ہستی حضرت زید کی تھی جو امام زین العابدین علیہ السلام کے بزرگ مرتبہ فرزند تھے ان کی عبادت زہد و تقویٰ کا بھی ملک عرب میں شہرہ تھا، مستند اور مسلّم حافظ قرآن تھے بنی امیہ کے مظالم سے تنگ آ کر انھوں نے بھی میدان جہاد میں قدم رکھا

امام جعفر صادق علیہ السلام کے لئے یہ موقع نہایت نازک تھا مظالم بنی امیہ سے نفرت میں ظاہر ہے کہ آپ زید کے ساتھ متفق تھے پھر جناب زید آپ کے چچا بھی تھے جن کا احترام آپ لازم سمجھتے تھے مگر آپ کی انجام بین نگاہ دیکھ رہی تھی کہ یہ اقدام کسی مفید نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اس لئے عملی طور سے آپ ان کا ساتھ دینا مناسب نہ سمجھتے تھے مگر یہ واقعہ ہوتے ہوئے

بھی خود ان کی ذات سے آپ کو انتہائی ہمدردی تھی آپ نے مناسب طریقہ پر انھیں مصلحت بینی کی دعوت دی۔ مگر اہل عراق کی ایک بڑی جماعت کے اقرار اطاعت و وفاداری نے جناب زید کو کامیابی کے توقعات پیدا کر دیے اور آخر سنہ ۱۲۰ھ میں ظالم فوج شام سے تین روز تک بہادری کے ساتھ جنگ کرنے کے بعد شہید ہوگئے۔ دشمن کا جذبۂ انتقام اتنے ہی پر ختم نہیں ہوا۔ بلکہ دفن ہو چکنے کے بعد ان کی لاش کو قبر سے نکالا گیا اور سر کو جدا کر کے ہشام کے پاس بطور تحفہ بھیجا گیا اور لاش کو دروازہ کوفہ پر سولی دی گئی اور کئی برس تک اسی طرح اسے آویزاں رکھا گیا۔ جناب زید کے ایک سال کے بعد ان کے بیٹے یحیٰی ابن زید بھی شہید ہوئے۔ یقیناً ان حالات کا امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر گہرا اثر پڑ رہا تھا مگر وہ ناجذبات سے بلند فرائض کی پابندی تھی کہ اس کے باوجود آپ نے اپنے خاموش اشتغال کو جو اشاعت علوم اہلبیتؑ اور نشر شریعت کے قدرت کی جانب سے آپ کے سپرد تھے برابر جاری رکھا۔

**انقلاب سلطنت** بنی امیہ کا آخری دور ہنگاموں اور سیاسی کشمکشوں کا مرکز بن گیا تھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ بہت جلدی جلدی حکومتوں میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور اسی لئے امام جعفر صادق علیہ السلام کو بہت سی دنیاوی سلطنتوں کے دور سے گذرنا پڑا، ہشام بن عبدالملک کے بعد ولید بن یزید بن عبدالملک پھر یزید بن ولید ابن عبدالملک اس کے بعد ابراہیم بن ولید ابن عبدالملک اور آخر میں مروان حمار جس پر بنی امیہ کی ظالم حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔

جب سلطنت کی داخلی کمزوریاں قہر و غلبہ کی جڑیں ہلا چکی ہوں تو قدرتی بات ہے کہ وہ لوگ جو اس حکومت کے مظالم کا مدتوں نشانہ رہ چکے ہوں اور جنھیں ان کے حقوق سے محروم کر کے صرف تشدد کی طاقت سے ہمنے کا موقع نہ دیا گیا ہو، قفس کی تیلیوں کو کمزور پا کر پھڑپھڑانے کی کوشش کریں گے اور حکومت کے شکنجے کو ایک دم توڑ دینا چاہیں گے سوائے ایسے بلند افراد کے جو جذبات کی پیروی سے بلند ہوں۔ عام طور پر اس طرح کی انتقامی کوششوں میں مصلحت اندیشی کا دامن بھی ہاتھ سے چھوٹنے کا امکان ہے مگر وہ انسانی فطرت کا ایک کمزور پہلو ہے جس سے خاص خاص افراد ہی مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔

بنی ہاشم میں عام طور پر سلطنت بنی امیہ کے اس آخری دور میں اسی لئے ایک حرکت اور غیر معمولی اضطراب پایا جا رہا تھا اس اضطراب سے بنی عباس نے فائدہ اٹھایا انھوں نے اس آخری دورِ اموِیت میں پوشیدہ طریقے سے ممالک اسلامیہ میں ایک ایسی جماعت بنائی جس نے قسم کھائی تھی کہ ہم سلطنت کو بنی امیہ سے لیکر بنی ہاشم تک پہنچائیں گے جن کا وہ واقعی حق ہے حالانکہ حق تو ان میں سے مخصوص ہستیوں ہی میں منحصر تھا جو خدا کی طرف سے نوعِ انسانی کی رہبری اور سرداری کے حق دار قرار دیئے گئے تھے مگر یہ وہی جذبات سے بلند انسان تھے جو موقع کی سیاسی رفتار سے ہنگامی فوائد حاصل کرنا اپنا نصب العین نہ رکھتے تھے۔ سلسلہ بنی ہاشم میں سے ان حضرات کی خاموشی قائم رہنے کے ساتھ اس ہمدردی کو جو عوام میں خاندانِ ہاشم

کے ساتھ پائی جاتی تھی بنی عباس نے اپنے لئے حصول سلطنت کا ذریعہ قرار دیا حالانکہ انھوں نے سلطنت پانے کے ساتھ بنی ہاشم کے اصلی حقداروں سے ویسا ہی یا اس سے زیادہ سخت سلوک کیا جو بنی امیہ ان کے ساتھ کر چکے تھے یہ واقعات مختلف اماموں کے حالات میں آئندہ آپ کے سامنے آئیں گے۔

بنی عباس میں سے سب سے پہلے محمد بن علی بن عبد اللہ بن عباس نے بنی امیہ کے خلاف تحریک شروع کی اور ایران میں مبلغین بھیجے جو مخفی طریقہ پر لوگوں سے بنی ہاشم کی وفاداری کا عہد و پیمان حاصل کریں محمد بن علی کے بعد ان کے بیٹے ابراہیم قائم مقام ہوئے۔ جناب زید اور ان کے صاحبزادے جناب یحییٰ کے دردناک واقعات شہادت سے بنی امیہ کے خلاف غم و غصہ میں اضافہ ہو گیا۔ اس سے بھی بنی عباس نے فائدہ اٹھایا اور ابو سلمہ خلال کے ذریعہ سے عراق میں بھی اپنے اثرات قائم کرنے کا موقع ملا رفتہ رفتہ اس جماعت کے حلقہ اثر میں اضافہ ہوتا گیا اور ابو مسلم خراسانی کی مدد سے عراق عجم کا پورا علاقہ قبضہ میں آگیا اور بنی امیہ کی طرف کے حاکم کو وہاں سے فرار اختیار کرنا پڑا۔ ۱۲۹ھ سے عراق عجم اور خراسان وغیرہ میں سلاطین بنی امیہ کے نام خطبہ سے خارج ہو کر ابراہیم بن محمد کا نام داخل کر دیا گیا

ابھی تک سلطنت بنی امیہ یہ سمجھتی تھی کہ یہ ایک مقامی مخالف تحریک ہے جو ایران میں محدود ہے مگر اب جاسوسوں نے اطلاع دی کہ اس کا تعلق ابراہیم ابن محمد بن عباس کے ساتھ ہے جو مقام جابلقا میں رہتے ہیں اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ابراہیم کو قید کر دیا گیا اور قید خانہ ہی میں پھر ان کو

قتل کردیا گیا۔ ان کے پس ماندگان دوسرے افراد بنی عباس کے ساتھ بھاگ کر عراق میں ابوسلمہ کے پاس چلے گئے۔ ابومسلم خراسانی کو جوان حالات کی اطلاع ہوئی تو ایک فوج کو عراق کی طرف روانہ کیا جس نے عموی طاقت کو شکست دیکر عراق کو آزاد کرالیا

ابوسلمہ خلال جو وزیر آل محمدؐ کے نام سے مشہور ہیں بنی فاطمہؑ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے انھوں نے چند خطوط اولاد رسولؐ میں سے چند بزرگوں کے نام لکھے اور ان کو قبول خلافت کی دعوت دی ان میں سے ایک خط حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے نام بھی تھا سیاست کی دنیا میں ایسے مواقع اپنے اقتدار کے قائم کرنے کے لئے غنیمت سمجھے جاتے ہیں مگر وہ انسانی خوداری و استغنا کا مثالی مجسمہ تھا جس نے اپنے فرائض منصبی کے لحاظ سے اس موقع کو ٹھکرادیا اور بجائے جواب دینے کے حقارت آمیز طریقہ پر اس خط کو آگ کی نذر کردیا۔

ادھر کوفہ میں ابومسلم خراسانی کے تابعین اور بنی عباس کے ہواخواہوں نے عبداللہ سفاح کے ہاتھ پر ۱۴ ربیع الثانی ۱۳۲ھ کو بیعت کرلی اور اس کو امت اسلامیہ کا خلیفہ اور فرمانروا تسلیم کرلیا۔ عراق میں اقتدار قائم کرنے کے بعد انھوں نے دمشق پر چڑھائی کردی۔ مروان حمار نے بھی بڑے لشکر کے ساتھ مقابلہ کیا۔ مگر بہت جلد اس کی فوج کو شکست ہوئی۔ مروان نے فرار کیا اور آخر افریقہ کی سرزمین پر پہنچکر قتل ہوا۔ اس کے بعد سفاح نے بنی امیہ کا قتل عام کرایا۔ سلاطین بنی امیہ کی قبریں کھدوائیں اور ان کی لاشوں کے ساتھ عبرتناک

سلوک کرگئے۔ اس طرح قدرت کا انتقام جو ان ظالموں سے لیا جانا ضروری تھا بنی عباس کے ہاتھوں دنیا کی نگاہ کے سامنے آیا۔ ۱۳۶ھ میں ابو عبداللہ سفاح بنی عباس کے پہلے خلیفہ کا انتقال ہوگیا جس کے بعد اس کا بھائی ابو جعفر منصور تخت خلافت پر بیٹھا جو منصور دوانیقی کے نام سے مشہور ہے

**سادات پر مظالم** یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ بنی عباس نے ان ہمدردیوں سے جو عوام کو بنی فاطمہ کے ساتھ تھیں ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور انھوں نے دنیا کو یہ دھوکا دیا تھا کہ ہم اہلبیت رسول کے حقوق کی حفاظت کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے رضائے آل محمد ہی کے نام پر لوگوں کو اپنی نصرت و حمایت پر آمادہ کیا تھا اور اسی کو اپنا نعرہ جنگ قرار دیا تھا۔ اس لئے انھیں برسر اقتدار آنے کے بعد اور بنی امیہ کو تباہ کرنے کے بعد سب سے بڑا اندیشہ تھا کہ کہیں ہمارا یہ فریب دنیا پر کھل نہ جائے اور یہ تحریک نہ پیدا ہوجائے کہ خلافت بنی عباس کے بجائے بنی فاطمہ کے سپرد ہونا چاہیئے جو حقیقت میں اس کے اہل ہیں۔ ابو سلمہ خلال بنی فاطمہ کے ہمدردوں میں سے تھا۔ اسلئے یہ خطرہ تھا کہ وہ اس تحریک کی حمایت نہ کرے۔ لہذا سب سے پہلے ابو سلمہ کو راستے سے ہٹایا گیا اور وہ باوجود ان احسانات کے جو بنی عباس کے ساتھ کرچکا تھا سفاح ہی کے زمانہ میں تشدد کا نشانہ بنا اور تلوار کے گھاٹ اتارا گیا۔ ایران میں ابو مسلم خراسانی کا اثر تھا۔ منصور نے انتہائی مکاری اور غداری کے ساتھ اس کی زندگی کا بھی خاتمہ کردیا۔

اب اسے اپنی من مانی کارروائیوں میں کسی با اثر اور صاحب اقتدار

شخصیت کی مزاحمت کا اندیشہ نہ تھا۔ لہذا اس کے ظلم و ستم کا رخ سادات بنی فاطمہ کی طرف مڑ گیا۔ مولانا شبلی سیرت نعمان میں لکھتے ہیں "صرف بدگمانی پر منصور نے سادات علویین کی بیخ کنی شروع کر دی جو لوگ ان میں ممتاز تھے ان کے ساتھ زیادہ بے رحمیاں کی گئیں محمد ابن ابراہیم کہ حسن و جمال میں یگاد روزگار تھے اور اسی وجہ سے دیباج کہلاتے تھے۔ زندہ دیواروں میں چنوا دیے گئے۔ ان بے رحمیوں کی ایک داستان ہے جس کے بیان کرنے کو بڑا سخت دل چاہیئے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے دل پر ان حالات کا بہت اثر ہوتا تھا چنانچہ جب سادات بنی حسن طوق و زنجیر میں قید کر کے مدینہ سے لیجائے جا رہے تھے تو حضرت ایک مکان کی آڑ میں کھڑے ہوئے ان کی حالت کو دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے اور فرما رہے تھے کہ" افسوس مکہ و مدینہ بھی دار الامن نہ رہا پھر آپ نے اولاد انصار کی حالت پر افسوس کیا کہ انصار نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو اس عہد و پیمان پر مدینہ تشریف لانے کی دعوت دی تھی کہ ہم آپ کی اور آپ کی اولاد کی اسی طرح حفاظت و حمایت کریں گے جس طرح اپنے اہل و عیال اور جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں مگر آج انصار کی اولاد باقی ہے اور کوئی ان سادات کی مدد نہیں کرتا یہ فرما کر آپ بیت الشرف کی طرف واپس ہوئے اور بیس دن تک شدت سے بیمار رہے

ان قیدیوں میں امام حسن علیہ السلام کے صاحبزادے عبد اللہ محض بھی تھے جنھوں نے کبر سنی کے عالم میں عرصہ تک قید کی مصیبتیں اٹھائیں۔ ان کے بیٹے محمد نفس زکیہ

نے حکومت کا مقابلہ کیا اور ۱۴۵ھ میں دشمن کے ہاتھ سے مدینہ منورہ کے قریب شہید ہوئے جوان بیٹے کا سر بوڑھے باپ کے پاس قید خانہ میں بھیجا گیا اور یہ صدمہ ایسا تھا کہ جس سے عبداللہ محض پھر زندہ نہ رہ سکے اور ان کی روح نے جسم سے مفارقت کی۔ اس کے بعد عبداللہ کے دوسرے صاحبزادے ابراہیم بھی منصور کی فوج کے مقابلہ میں جنگ کر کے کوفہ میں شہید ہوئے۔ اسی طرح عباس ابن حسن عمر ابن حسن مثنیٰ۔ علی و عبداللہ فرزندان۔ نفس زکیہ۔ موسیٰ اور یحییٰ برادران نفس زکیہ وغیرہ بھی بے دردی اور بے رحمی سے قتل کئے گئے۔ بہت سے سادات عمارتوں میں زندہ چنوا دیئے گئے۔

## امام کے ساتھ بدسلوکیاں

ان تمام ناگوار حالات کے باوجود جن کا تذکرہ انتہائی اختصار کے ساتھ اوپر لکھا گیا۔ امام جعفر صادق علیہ السلام خاموشی کے ساتھ علوم اہلبیتؑ کی اشاعت میں مصروف رہے اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ لوگ بھی جو بحیثیت امامت حقہ آپ کی معرفت نہ رکھتے تھے یا اسے تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے وہ بھی آپ کی علمی عظمت کو مانتے ہوئے آپ کے حلقۂ درس میں داخل ہونے کو فخر سمجھتے تھے۔

منصور نے پہلے حضرت کی علمی عظمت کا اثر عوام کے دل سے کم کرنے کے لئے ایک تدبیر یہ کی کہ آپ کے مقابلے میں ایسے اشخاص کو بحیثیت فقیہ اور عالم کے کھڑا کر دیا جو آپ کے شاگردوں کے سامنے بھی زبان کھولنے کی قدرت نہ رکھتے تھے اور پھر وہ خود اس کا اقرار رکھتے تھے کہ ہمیں جو کچھ

زیادہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی بارگاہ سے حاصل ہوا اگر اقتدار حکومت ان کے فتوے کو مستند قرار دیتا تھا اور اس طرح حضرت صادق آل محمدؐ کی مرجعیت کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس میں ناکامی ہوئی تو حضرت کی ایذا رسانی اور قتل یا گرفتاری کی تدبیریں کی جانے لگیں اس کے لئے ہر ہر شہر اور ہر ہر قصبہ میں جاسوس مقرر کئے گئے جو شیعوں کے حالات پر نظر رکھیں اور جن کے متعلق یہ معلوم ہو کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی محبت کا دم بھرتا ہے اسے گرفتار کیا جائے۔

چنانچہ معلیٰ ابن خنیس ان ہی شیعوں میں سے تھے جو گرفتار کئے گئے اور ظلم و ستم کے ساتھ شہید کئے گئے خود امام جعفر صادق علیہ السلام کو تقریباً پانچ مرتبہ مدینہ سے دربار شاہی میں طلب کیا گیا جو آپ کے لئے سخت روحانی تکلیف کا باعث تھا یہ اور بات ہے کہ کسی مرتبہ آپ کے خلاف کوئی بہانہ اسے ایسا نہ مل سکا کہ آپ کے قید یا قتل کئے جانے کا حکم دیتا بلکہ اس سلسلہ میں عراق کے اندر ایک مدت کے قیام سے علوم اہلبیتؑ کی اشاعت کا حلقہ وسیع ہوا اور اس کو محسوس کر کے منصور نے پھر آپ کو مدینہ بھجوا دیا اس کے بعد بھی آپ ایذا رسانی سے محفوظ نہیں رہے۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ آپ کے گھر میں آگ لگا دی گئی قدرت خدا تھی کہ وہ آگ جلد فرو ہو گئی اور آپ کے متعلقین اور اصحاب کو کوئی صدمہ نہیں پہونچا۔

**اخلاق و اوصاف** آپ اسی عصمت کی ایک کڑی تھے جسے خداوند عالم

نے نوع انسانی کے لئے نمونہ کامل بنا کر پیدا ہی کیا تھا ان کے اخلاق و اوصاف زندگی کے ہر شعبہ میں معیاری حیثیت رکھتے تھے خاص خاص اوصاف جن کے متعلق مورخین نے مخصوص طور پر واقعات نقل کئے ہیں۔ جہاں زاہدی خیر و خیرات مخفی طریقہ پر غربا کی خبرگیری، عزیزوں کے ساتھ حسن سلوک، عفو جرائم صبر و تحمل وغیرہ ہیں۔

ایک مرتبہ ایک حاجی مدینہ میں وارد ہوا۔ اور مسجد رسولؐ میں سو گیا آنکھ کھلی تو اسے شبہہ ہوا کہ اس کی ایک ہزار کی تھیلی موجود نہیں ہے اس نے اِدھر دیکھا اُدھر دیکھا کسی کو نہ پایا ایک گوشہ مسجد میں امام جعفر صادق علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے وہ آپ کو بالکل نہ پہچانتا تھا آپ کے پاس آ کر کہنے لگا کہ "میری تھیلی تم نے لی ہے" حضرت نے فرمایا "اس میں کیا تھا" اس نے کہا ایک ہزار دینار۔ حضرت نے فرمایا میرے ساتھ میرے مکان تک آؤ، وہ آپ کے ساتھ ہو گیا۔ بیت الشرف پر تشریف لا کر ایک ہزار دینار اس کے حوالے کر دیئے۔ وہ مسجد میں واپس گیا اور اپنا اسباب اٹھانے لگا تو خود اس کے دیناروں کی تھیلی اسباب میں نظر آئی۔ یہ دیکھ کر وہ بہت شرمندہ ہوا اور دوڑتا ہوا پھر امام کی خدمت میں آیا اور عذر خواہی کرتے ہوئے وہ ہزار دینار واپس کرنا چاہے حضرت نے فرمایا "ہم جو کچھ دے دیتے ہیں وہ پھر واپس نہیں لیتے"

موجودہ زمانہ میں یہ حالات سب ہی کی آنکھوں سے دیکھے ہوئے ہیں کسی کو شبہ یا اندیشہ پیدا ہوتا ہے کہ اناج مشکل سے ملے گا تو جس کو جتنا ممکن

وہ اناج خرید کر رکھ لیتا ہے مگر امام جعفر صادق علیہ السلام کے کردار کا
ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے اپنے وکیل معتب سے ارشاد فرمایا
کہ غلہ روز بروز مدینہ میں گراں ہوتا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں کس قدر غلہ
ہوگا؟ معتب نے کہا کہ "ہمیں اس گرانی اور قحط کی تکلیف کا کوئی اندیشہ
نہیں ہے ہمارے پاس غلہ کا اتنا ذخیرہ ہے جو بہت عرصہ تک کافی ہوگا۔" حضرت
نے فرمایا "یہ تمام غلہ فروخت کر ڈالو اس کے بعد جو حال سب کا ہو وہی ہمارا
بھی ہو" جب غلہ فروخت کر دیا گیا تو فرمایا اب خالص گیہوں کی روٹی نہ
پکا کرے بلکہ آدھے گیہوں اور آدھے جو۔ جہاں تک ممکن ہو ہمیں غریبوں کا ساتھ
دینا چاہیئے۔"

آپ کا قاعدہ تھا کہ آپ مالداروں سے زیادہ غریبوں کی عزت کرتے تھے
مزدوروں کی بڑی قدر فرماتے تھے۔ خود بھی تجارت فرماتے تھے اور اکثر اپنے
باغوں میں بہ نفس نفیس محنت بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ بیلچہ ہاتھ میں
لئے باغ میں کام کر رہے تھے اور پسینہ سے تمام جسم تر ہو گیا تھا۔ کسی نے کہا "یہ
بیلچہ مجھے عنایت فرمائیے کہ میں یہ خدمت انجام دوں۔ حضرت نے فرمایا طلب
معاش میں دھوپ اور گرمی کی تکلیف سہنا عیب کی بات نہیں۔ غلاموں اور
کنیزوں پر وہی مہربانی رہتی تھی جو اس گھرانے کی امتیازی صفت تھی۔ اس کا
ایک حیرت انگیز نمونہ یہ ہے جسے سفیان ثوری نے بیان کیا ہے کہ میں ایک
مرتبہ امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ دیکھا کہ چہرہ مبارک
کا رنگ متغیر ہے۔ میں نے سبب دریافت کیا۔ فرمایا "میں نے منع کیا تھا کہ کوئی

مکان کے کوٹھے پر نہ چڑھے۔ اس وقت جو گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک کنیز جو ایک بچہ کی پرورش پر معین تھی اسے گود میں لئے زینہ سے اوپر جا رہی ہے مجھے دیکھا تو ایسا خوف طاری ہوا کہ بدحواسی میں بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس صدمہ سے جاں بحق تسلیم ہوا مجھے بچے کے مرنے کا اتنا صدمہ نہیں ہوا جتنا اس کا رنج ہے کہ اس کنیز پر اتنا رعب و ہراس کیوں طاری ہوا پھر حضرت نے اس کنیز کو پکار کر فرمایا "ڈرو نہیں میں نے تم کو راہ خدا میں آزاد کر دیا" اس کے بعد حضرت بچے کی تجہیز و تکفین کی طرف متوجہ ہوئے۔

**اشاعت علوم** تمام عالم اسلامی میں آپ کی علمی جلالت کا شہرہ تھا اور دور دور سے لوگ تحصیل علم کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کے شاگردوں کی تعداد چار ہزار تک پہنچ گئی تھی۔ ان میں فقہ کے علماء بھی تھے تفسیر کے بھی متکلمین بھی تھے اور مناظرین بھی۔ آپ کے دربار میں مخالفین مذہب آ آ کر سوالات پیش کرتے تھے اور آپ کے اصحاب سے اور ان سے مناظرے ہوتے رہتے تھے جن پر کبھی کبھی مناظرہ کے ختم ہونے پر اور فریق مخالف کے شکست کھا کر چلے جانے کے بعد آپ نقد و تبصرہ بھی فرماتے تھے اور اصحاب کو ان کی بحث کے کمزور پہلو بتلا بھی دیتے تھے تاکہ آئندہ وہ ان باتوں کا خیال رکھیں۔ کبھی آپ خود بھی مخالفین مذہب اور بالخصوص دہریوں سے مناظرہ فرماتے تھے علاوہ علوم فقہ و کلام وغیرہ کے علوم غریبہ جیسے ریاضی اور کیمیا وغیرہ کی بھی بعض شاگردوں کو تعلیم دی تھی۔ چنانچہ آپ کے اصحاب میں سے جابر بن حیان طرسوسی سائنس اور ریاضی کے

مشہور امام فن ہیں جنھوں نے چار سو رسالے امام جعفر صادق علیہ السلام کے افادات کو حاصل کر کے تصنیف کئے۔ آپ کے اصحاب میں سے بہت سے بڑے فقہا تھے جنھوں نے کتابیں تصنیف کیں جن کی تعداد سیکڑوں تک پہونچتی ہے ایسی مصروف زندگی رکھنے والے انسان کو جاہ و سلطنت کے حاصل

**وفات** کرنے کی فکروں سے کیا مطلب؛ مگر آپ کی علمی مرجعیت اور کمالات کی شہرت ہی سلطنت وقت کے لئے ایک مستقل خطرہ محسوس ہوتی تھی جبکہ یہ معلوم تھا کہ اصلی خلافت کے حقدار یہی ہیں جب حکومت کی تمام کوششیں کے باوجود کوئی بہانہ اسے آپ کے خلاف کسی کھلے ہوئے اقدام اور خوں ریزی کا نہ مل سکا تو آخر خاموش حربہ زہر کا اختیار کیا گیا اور زہر آلود انگور حاکم مدینہ کے ذریعہ سے آپ کی خدمت میں پیش کئے گئے جن کے کھاتے ہی زہر کا اثر جسم میں سرایت کر گیا اور ۱۵ شوال ۱۴۸ھ میں ۶۵ سال کی عمر میں وفات پائی آپ کے فرزند اکبر اور جانشین حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی اور جنت البقیع کے اس احاطے میں کہ جہاں اس کے پہلے امام حسن علیہ السلام امام زین العابدینؑ اور امام محمد باقر علیہ السلام دفن ہو چکے تھے آپ کو بھی دفن کیا گیا۔

# ساتویں امام

## حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام

**نام و نسب** اسم مبارک موسیٰ کنیت ابوالحسنؑ اور لقب کاظم تھا اور اسی لئے امام موسیٰ کاظم کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام تھے جن کا خاندانی سلسلہ حضرت امام حسینؑ شہید کربلا کے واسطے سے پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم تک پہنچتا ہے

آپ کی والدہ ماجدہ حمیدہ خاتون ملک بربر کی باشندہ تھیں

**ولادت** سات صفر ۱۲۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ اس وقت آپ کے والد بزرگوار حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام مسند امامت پر متمکن تھے اور آپ کے فیوض علمی کا دھارا پوری طاقت کے ساتھ بہہ رہا تھا اگرچہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے پہلے آپ کے دو بڑے بھائی اسمٰعیل اور عبداللہ پیدا ہو چکے تھے۔ مگر اس صاحبزادہ کی ولادت سے گھرانے کو وہ خوشی ہوئی جو اس کے پہلے محسوس نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ اس روحانی امانت کا حامل جو رسول کے بعد اس سلسلہ کے افراد میں ایک دوسرے کے بعد چلی آ رہی تھی یہی پیدا ہونے والا مبارک بچہ تھا۔

**نشوونما اور تربیت** آپ کی عمر کے بیس ۲۰ برس اپنے والد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السلام کے سایۂ تربیت میں گزرے، ایک طرف خدا کے دیئے ہوئے نظری کمال کے جوہر، اور دوسری طرف اس باپ کی تربیت جس نے پیغمبرؐ کے بتائے ہوئے مکارم اخلاق کی یاد کو بھولی ہوئی دنیا میں ایسا تازہ کر دیا کہ انھیں ایک طرح سے اپنا بنا لیا۔ اور جس کی بنا پر ملت جعفری نام ہو گیا۔ امام موسیٰ کاظمؑ نے بچپنا اور جوانی کا کافی حصہ اسی مقدس آغوش تعلیم میں گزارا۔ یہاں تک کہ تمام دنیا کے سامنے آپ کے ذاتی کمالات و فضائل روشن ہو گئے اور امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنا جانشین مقرر فرما دیا۔ باوجودیکہ آپ کے بڑے بھائی بھی موجود تھے مگر خدا کی طرف کا منصب میراث کا ترکہ نہیں ہے بلکہ ذاتی کمال کو ڈھونڈھتا ہے سلسلہ معصومینؑ میں امام حسنؑ کے بعد بجائے ان کی اولاد کے امام حسین کا امام ہونا اور اولاد امام جعفر صادق علیہ السلام میں بجائے فرزند اکبر کے امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی طرف امامت کا منتقل ہونا اس کا ثبوت ہے کہ معیار امامت میں نسبی وراثت کو مدنظر نہیں رکھا گیا ہے۔

**امامت** ۱۴۸ھ میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی وفات ہوئی اس وقت سے حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام بذات خود فرائض امامت کے ذمہ دار ہوئے اس وقت سلطنت عباسیہ کے تخت پر منصور دوانقی بادشاہ تھا یہ وہی ظالم بادشاہ تھا جس کے ہاتھوں لاتعداد سادات مظالم کا نشانہ بن چکے تھے تلوار کے گھاٹ اتار دیے گئے، دیواروں میں چنوا دیئے گئے یا قید رکھے

گئے تھے خود امام جعفر صادق علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کی جا چکی تھیں۔ مختلف صورت سے تکلیفیں پہونچائی گئی تھیں، یہاں تک کہ منصور ہی کا بھیجا ہوا زہر تھا جس سے اب آپ دنیا سے رخصت ہو رہے تھے ان حالات میں آپ کو اپنے جانشین کے متعلق یہ قطعی اندیشہ تھا کہ حکومت وقت اسے زندہ نہ رہنے دے گی اس لئے آپ نے آخری وقت ایک اخلاقی بوجھ حکومت کے کاندھوں پر رکھ دینے کے لئے یہ صورت اختیار فرمائی کہ اپنی جائداد اور گھر بار کے انتظام کے لئے پانچ شخصوں کی ایک جماعت مقرر فرمائی جن میں پہلا شخص خود خلیفہ وقت منصور عباسی تھا۔ اس کے علاوہ محمد بن سلیمان حاکم مدینہ اور عبداللہ افطح جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے سن میں بڑے بھائی تھے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اور ان کی والدہ معظمہ حمیدہ خاتون۔

امام کا اندیشہ بالکل صحیح تھا اور آپ کا تحفظ بھی کامیاب ثابت ہوا۔ چنانچہ جب حضرت کی وفات کی اطلاع منصور کو پہنچی تو اس نے پہلے تو سیاسی مصلحت سے اظہار رنج کیا تین مرتبہ انا للہ وانا الیہ راجعون کہا اور کہا کہ اب بھلا جعفرؑ کا مثل کون ہے۔ اس کے بعد حاکم مدینہ کو لکھا کہ اگر جعفر صادقؑ نے کسی شخص کو اپنا وصی مقرر کیا ہو تو اس کا سر فوراً قلم کر دو۔ حاکم مدینہ نے جواب لکھا کہ انھوں نے تو پانچ وصی مقرر کئے ہیں جن میں سے پہلے آپ خود ہیں یہ جواب پڑھ کر منصور دیر تک خاموش رہا اور سوچنے کے بعد کہنے لگا کہ اس صورت میں تو یہ لوگ قتل نہیں کئے جا سکتے اس کے بعد دس برس منصور زندہ رہا لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے کوئی تعرض نہیں کیا اور آپ مذہبی فرائض امامت کی

انجام دہی میں امن و سکون کے ساتھ مصروف رہے یہ بھی تھا کہ اس زمانہ میں منصور شہر بغداد کی تعمیر میں مصروف تھا۔ جس سے ۱۵۷ھ میں یعنی اپنی موت سے صرف ایک سال پہلے اسے فراغت ہوئی۔ اس لئے وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے متعلق کسی ایذا رسانی کی طرف متوجہ نہیں ہوا

## دورِ ابتلا

۱۵۸ھ کے آخر میں منصور دوانقی دنیا سے رخصت ہوا اور اس کا بیٹا مہدی تخت سلطنت پر بیٹھا شروع میں تو اس نے بھی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے عزت و احترام کے خلاف کوئی برتاؤ نہیں کیا مگر چند سال کے بعد پھر وہی بنی فاطمہ کی مخالفت کا جذبہ ابھرا اور ۱۶۴ھ میں جب وہ حج کے نام سے حجاز کی طرف آیا تو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو اپنے ساتھ مکہ سے بغداد لے گیا اور قید کر دیا ایک سال تک حضرت اس کی قید میں رہے پھر اس کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور حضرت کو مدینہ کی طرف واپسی کا موقع دیا گیا۔ مہدی کے بعد اس کا بھائی ہادی ۱۶۹ھ میں تخت سلطنت پر بیٹھا اور صرف ایک سال ایک مہینہ تک اس نے سلطنت کی اس کے بعد ہارون الرشید کا زمانہ آیا جس میں پھر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو آزادی کے ساتھ سانس لینا نصیب نہیں ہوا۔

## اخلاق و اوصاف

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اسی مقدس سلسلہ کی ایک فرد تھے جس کو خالق نے نوع انسان کے لئے معیار کمال قرار دیا تھا اس لئے ان میں سے ہر ایک اپنے وقت میں بہترین اخلاق و اوصاف کا مرقع تھا۔ بیشک یہ ایک حقیقت ہے کہ بعض افراد میں

بعض صفات اتنے ممتاز نظر آتے ہیں کہ سب سے پہلے ان پر نظر پڑتی ہے چنانچہ ساتویں امام میں تحمل، برداشت اور غصہ کو ضبط کرنے کی صفت اتنی نمایاں تھی کہ آپ کا لقب "کاظم" قرار پا گیا جس کے معنی ہی ہیں غصے کو پینے والا آپ کو کبھی کسی نے ترش روئی اور سختی کے ساتھ بات کرتے نہیں دیکھا اور انتہائی ناگوار حالات میں بھی مسکراتے ہوئے نظر آئے۔ مدینہ کے ایک حاکم سے آپ کو سخت تکلیفیں پہنچیں یہاں تک کہ وہ جناب امیر علیہ السلام کی شان میں بھی نازیبا الفاظ استعمال کیا کرتا تھا مگر حضرت نے اپنے اصحاب کو ہمیشہ اس کے جواب دینے سے روکا۔

جب اصحاب نے اس کی گستاخیوں کی بہت شکایت کی اور یہ کہا کہ اب ہمیں ضبط کی تاب نہیں ہمیں اس سے انتقام لینے کی اجازت دیجئے تو حضرت نے فرمایا کہ "میں خود اس کا تدارک کروں گا" اس طرح ان کے جذبات میں سکون پیدا کر دینے کے بعد حضرت خود اس شخص کے پاس اس کی زراعت پر تشریف لے گئے اور کچھ ایسا احسان اور سلوک فرمایا کہ وہ اپنی گستاخیوں پر نادم ہوا اور اپنے طرز عمل کو بدل دیا حضرت نے اپنے اصحاب سے صورت حال بیان فرما کر پوچھا کہ جو میں نے اس کے ساتھ کیا وہ اچھا تھا یا جس طرح تم لوگ اس کے ساتھ کرنا چاہتے تھے سب نے کہا یقیناً حضور نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہی بہتر تھا اس طرح آپ نے اپنے جد بزرگوار حضرت امیر علیہ السلام کے اس ارشاد کو عمل میں لا کر دکھلایا جو آج تک نہج البلاغہ میں موجود ہے کہ اپنے دشمن پر احسان کے ساتھ فتح حاصل کرو کیونکہ یہ دو قسم کی فتح میں زیادہ پر لطف کامیابی ہے بے شک

اس کے لئے فریق مخالف کے ظرف کا صحیح اندازہ ضروری ہے۔ اور اسی لئے حضرت علیؑ نے ان الفاظ کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے کہ "خبردار یہ عدم تشدد کا طریقہ نااہل کے ساتھ اختیار نہ کرنا ورنہ اس کے تشدد میں اضافہ ہو جائے گا۔"

یقیناً ایسے عدم تشدد کے موقع کو پہچاننے کے لئے ایسی ہی بالغ نگاہ کی ضرورت ہے جیسی امامؑ کو حاصل تھی مگر یہ اس وقت میں ہے جب مخالف کی طرف سے کوئی ایسا عمل ہو چکا ہو جو اس کے ساتھ انتقامی تشدد کا جواز پیدا کر سکے لیکن اگر اس کی طرف سے کوئی اقدام ابھی ایسا نہ ہوا تو یہ حضرات بہرحال اس کے ساتھ احسان کرنا پسند کرتے تھے تاکہ اس کے خلاف حجت تمام ہو اور اسے اپنے جارحانہ اقدام کے لئے تلاش سے بھی کوئی عذر نہ مل سکے بالکل اسی طرح جیسے ابن ملجم کے ساتھ جو جناب امیر علیہ السلام کو شہید کرنے والا تھا آخر وقت تک جناب امیر علیہ السلام احسان فرماتے رہے۔ اسی طرح محمد ابن اسمٰعیل کے ساتھ جو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی جان لینے کا باعث ہوا آپ برابر احسان فرماتے رہے، یہاں تک کہ اس سفر کے لئے جو اس نے مدینہ سے بغداد کی جانب خلیفہ عباسی کے پاس امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شکائتیں کرنے کے لئے کیا تھا ساڑھے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم کی رقم خود حضرت ہی نے عطا فرمائی تھی جس کو لے کر وہ روانہ ہوا تھا۔ آپ کو زمانہ بہت ناساز گار ملا تھا نہ اس وقت وہ علمی دربار قائم رہ سکتا تھا جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے زمانہ میں قائم رہ چکا تھا۔ نہ دوسرے ذرائع سے تبلیغ و اشاعت ممکن تھی بس آپ کی خاموش سیرت ہی تھی جو دنیا کو آل محمدؐ کے تعلیمات سے روشناس بنا سکتی تھی

آپ اپنے مجمعوں میں بھی اکثر بالکل خاموش رہتے تھے یہاں تک کہ جب تک آپ سے کسی امر کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔ آپ گفتگو میں ابتدا بھی نہ فرماتے تھے اس کے باوجود آپ کی علمی جلالت کا سکّہ دوست اور دشمن سب کے دل پر قائم تھا اور آپ کی سیرت کی بلندی کو بھی سب مانتے تھے اسی لیے عام طور پر آپ کو کثرت عبادت اور شب زندہ داری کی وجہ سے "عبد صالح" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ آپ کی سخاوت اور فیاضی کا بھی خاص شہرہ تھا اور فقرائے مدینہ کی اکثر پوشیدہ طور پر خبر گیری فرماتے تھے۔ ہر نماز صبح کے تعقیبات کے بعد آفتاب کے بلند ہونے کے بعد سے پیشانی سجدے میں رکھ دیتے تھے اور زوال کے وقت سر اٹھاتے تھے۔ قرآن مجید کی نہایت دلکش انداز میں تلاوت فرماتے تھے خود بھی روتے جاتے تھے اور پاس بیٹھنے والے بھی آپ کی آواز سے متاثر ہو کر روتے تھے۔

## ہارون رشید کی خلافت اور امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے مخالفت

سنہ ۱۷۰ھ میں ہادی کے بعد ہارون تخت خلافت پر بیٹھا۔ سلطنت عباسیہ کے قدیم روایات جو سادات بنی فاطمہ کی مخالفت میں تھے، اس کے سامنے تھے خود اس کے باپ منصور کا رویہ جو امام جعفر صادق علیہ السلام کے خلاف تھا اسے معلوم تھا۔ اس کا یہ ارادہ کہ جعفر صادق علیہ السلام کے جانشین کو قتل کر ڈالا جائے یقیناً اس کے بیٹے ہارون کو معلوم ہو چکا ہوگا۔ وہ تو امام جعفر صادق علیہ السلام کی حکیمانہ وصیت کا اخلاقی دباؤ تھا جس نے منصور کے ہاتھ باندھ دیے تھے اور شہر بغداد کی تعمیر کی مصروفیت

تھی جس نے اُسے اُس جانب متوجہ نہ ہونے دیا تھا اب ہارون کے لئے ان میں سے کوئی بات مانع نہ تھی۔ تخت سلطنت پر بیٹھ کر اپنے اقتدار کو مضبوط رکھنے کے لیے سب سے پہلے یہی تصوّر پیدا ہو سکتا تھا کہ اس روحانیت کے مرکز کو جو مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں قائم ہے توڑنے کی کوشش کی جائے۔ مگر ایک طرف امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کا محتاط اور خاموش طرز عمل اور دوسری طرف سلطنت کے اندرونی مشکلات ان کی وجہ سے نو برس تک ہارون کو بھی کسی کھلے ہوئے تشدّد کا امام کے خلاف موقع نہیں ملا۔

اس دوران میں عبداللہ ابن حسن کے فرزند یحییٰ کا واقعہ درپیش ہوا اور وہ امان دیے جانے کے بعد تمام عہد وپیمان کو توڑ کر دردناک طریقے پر پہلے قید رکھے گئے اور پھر قتل کیے گئے۔ باوجودیکہ یحییٰ کے معاملات سے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کو کسی طرح کا سروکار نہ تھا۔ بلکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ان کو حکومت وقت کی مخالفت سے منع فرماتے تھے۔ مگر عداوت بنی فاطمہ کا جذبہ جو یحییٰ ابن عبداللہ کی مخالفت کے بہانے سے اُبھر گیا تھا۔ اس کی زد سے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام بھی محفوظ نہ رہ سکے۔ اُدھر یحییٰ ابن خالد برمکی نے جو وزیر اعظم تھا امین (فرزند ہارون رشید) کے اتالیق جعفر ابن محمد اشعث کی رقابت میں اس کے خلاف یہ الزام قائم کیا کہ یہ امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے شیعوں میں سے ہے اور ان کے اقتدار کا خواہاں ہے۔

براہ راست اس کا مقصد ہارون کو جعفر سے برگشتہ کرنا تھا لیکن بالواسطہ اس کا تعلق حضرت امام موسیٰ کاظم کے ساتھ بھی تھا۔ اسی لیے ہارون کو حضرت کی

ضرر رسانی کی فکر پیدا ہو گئی۔ اسی دوران میں یہ واقعہ ہوا کہ ہارون رشید حج کے ارادہ سے مکہ معظمہ میں آیا۔ اتفاق سے اسی سال امام موسیٰ کاظم بھی حج کو تشریف لائے ہوئے تھے ہارون نے اپنی آنکھ سے اس عظمت اور مرجعیت کا مشاہدہ کیا جو مسلمانوں میں امام موسیٰ کاظمؑ کے متعلق پائی جاتی تھی۔ اس سے بھی اس کے حسد کی آگ بھڑک اٹھی اس کے بعد اس میں محمد بن اسمٰعیل کی مخالفت نے اور اضافہ کر دیا

واقعہ یہ ہے کہ اسمٰعیل امام جعفر صادق علیہ السّلام کے بڑے فرزند تھے اور اس لیے ان کی زندگی میں عام طور پر لوگوں کا خیال یہ تھا کہ وہ امام جعفر صادق علیہ السّلام کے قائم مقام ہوں گے۔ مگر ان کا انتقال امام جعفر صادق علیہ السّلام کے زمانہ میں ہو گیا اور لوگوں کا یہ خیال غلط ثابت ہوا پھر بھی بعض سادہ لوح اصحاب اس خیال پر قائم رہے کہ جانشینی کا حق اسمٰعیل اور اولاد اسمٰعیل میں منحصر ہے۔ انھوں نے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کی امامت کو تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ اسماعیلیہ فرقہ مختصر تعداد میں سہی اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ محمدؐ ان ہی اسمٰعیل کے فرزند تھے اور اس لیے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام سے ایک طرح کی مخالفت پہلے سے رکھتے تھے مگر چونکہ ان کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم تھی اور وہ افراد کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے اس لیے ظاہری طور پر امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے یہاں آمد و رفت رکھتے تھے اور ظاہری طور پر قرابت داری کے تعلقات قائم کیے ہوئے تھے۔

ہارون رشید نے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کی مخالفت کی صورتوں پر غور کرتے ہوئے یحییٰ برمکی سے مشورہ لیا کہ میں چاہتا ہوں کہ اولاد ابوطالب میں سے کسی کو بلا کر اس سے موسیٰ بن جعفرؑ کے پورے پورے حالات دریافت کروں۔ یحییٰ جو خود

عداوت بنی فاطمہ میں ہارون سے کم نہ تھا اس نے محمد بن سمعیل کا پتہ دیا کہ آپ اُن کو بلا کر دریافت کریں تو صحیح حالات معلوم ہو سکیں گے۔ چنانچہ اسی وقت محمد ابن اسماعیل کے نام خط لکھا گیا۔

شہنشاہ وقت کا خط جو محمد ابن اسمعیل کو پہنچا تو اُنھوں نے اپنی دنیاوی کامیابی کا بہترین ذریعہ سمجھ کر فوراً بغداد جانے کا ارادہ کر لیا مگر ان دنوں ہاتھ بالکل خالی تھا۔ اتنا روپیہ پاس موجود نہ تھا کہ سامان سفر کرتے مجبوراً اسی ڈیوڑھی پر آنا پڑا جہاں کرم و عطا میں دوست اور دشمن کی تفریق نہ تھی۔ امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے پاس آکر بغداد جانے کا ارادہ ظاہر کیا حضرت خوب سمجھتے تھے کہ اس بغداد کے سفر کی بنیاد کیا ہے۔ حجت تمام کرنے کی غرض سے آپ نے سفر کا سبب دریافت کیا۔ اُنھوں نے اپنی پریشان حالی بیان کرتے ہوئے کہا کہ قرضدار بہت ہو گیا ہوں۔ خیال کرتا ہوں کہ شاید وہاں جا کر کوئی صورت بسر اوقات کی نکلے اور میرا قرضہ ادا ہو جائے۔ حضرت نے فرمایا وہاں جانے کی ضرورت نہیں ہے میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارا تمام قرضہ ادا کر دوں گا۔ اور جہاں تک ہو گا تمھارے ضروریات زندگی بھی پورے کرتا رہوں گا۔

افسوس ہے کہ محمد نے اس کے بعد بھی بغداد جانے کا ارادہ نہیں بدلا چلتے وقت حضرت سے رخصت ہونے لگے عرض کیا کہ مجھے وہاں کے متعلق کچھ ہدایت فرمائی جائے حضرت نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ جب اُنھوں نے کئی مرتبہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ " بس اتنا خیال رکھنا کہ میرے خون میں شریک نہ ہونا اور میرے بچوں کی یتیمی کے باعث نہ ہونا۔ محمد نے اس کے بعد بہت کہا کہ یہ بھلا کونسی بات ہے جو مجھ سے کہی جاتی ہے کچھ اور ہدایت فرمائیے حضرت نے اس کے علاوہ

کچھ کہنے سے انکار کیا جب وہ چلنے لگے تو حضرت نے ساڑھے چار سو دینار اور پندرہ سو درہم انھیں مصارف سفر کے لیے عطا فرمائے۔ نتیجہ وہی ہوا جو حضرت کے پیش نظر تھا۔ محمد ابن اسمٰعیل بغداد پہنچے اور وزیر اعظم یحییٰ برمکی کے مہمان ہوئے اس کے بعد یحییٰ کے ساتھ ہارون کے دربار میں پہنچے مصلحت وقت کی بنا پر بہت تعظیم و تکریم کی گئی اثنائے گفتگو میں ہارون نے مدینہ کے حالات دریافت کیے محمد نے انتہائی غلط بیانیوں کے ساتھ وہاں کے حالات کا تذکرہ کیا اور یہ بھی کہا کہ "میں نے آج تک نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ ایک ملک میں دو بادشاہ ہوں" اس نے کہا کہ اس کا کیا مطلب محمد نے کہا کہ بالکل اسی طرح جیسے آپ بغداد میں سلطنت کر رہے ہیں۔ موسیٰ کاظمؑ مدینہ میں اپنی سلطنت قائم کیے ہوئے ہیں۔ اطراف ملک سے ان کے پاس خراج پہنچتا ہے اور وہ آپ کے مقابلے کے دعویدار ہیں۔

یہی وہ باتیں تھیں جن کے کہنے کیلئے یحییٰ برمکی نے محمد کو منتخب کیا تھا ہارون کا غیظ و غضب انتہائی اشتعال کے درجہ تک پہنچ گیا اس نے محمد کو دس ہزار دینار عطا کر کے رخصت کیا۔ خدا کا کرنا یہ کہ محمد کو اس رقم سے فائدہ اٹھانے کا ایک دن بھی موقع نہیں ملا۔ اسی شب کو ان کے حلق میں درد پیدا ہوا صبح ہوتے ہوتے وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ہارون کو یہ خبر پہنچی تو اس نے اشرفیوں کے توڑے واپس منگوا لیے۔ مگر محمد کی باتوں کا اثر اس کے دل پر ایسا جم گیا تھا کہ اس نے یہ طے کر لیا کہ امام موسیٰ کاظمؑ کا نام صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔

چنانچہ ۱۷۹ھ میں پھر ہارون رشید نے مکہ معظمہ کا سفر کیا اور وہاں سے مدینہ منورہ گیا دو ایک روز قیام کے بعد کچھ لوگ امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کو گرفتار

کرنے کے لیے روانہ کیے جب یہ لوگ امام کے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حضرت روضۂ رسول پر ہیں۔ ان لوگوں نے روضۂ پیغمبرؐ کی عزّت کا بھی خیال نہ کیا حضرت اس وقت قبر رسولؐ کے نزدیک نماز میں مشغول تھے بے رحم دشمنوں نے آپ کو نماز کی حالت ہی میں قید کر لیا اور ہارون کے پاس لے گئے۔ مدینہ رسولؐ کے رہنے والوں کی بے حسی اس کے پہلے بھی بہت دفعہ دیکھی جا چکی تھی۔ یہ بھی اسکی ایک مثال تھی کہ رسولؐ کا فرزند روضۂ رسولؐ سے اس طرح گرفتار کر کے لے جایا جا رہا تھا مگر نام نہاد مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو کسی طرح کی آواز احتجاج بلند کرتا۔ یہ بیس شوال ۱۷۹ھ کا واقعہ ہے۔

ہارون نے اس اندیشہ سے کہ کوئی جماعت امام موسیٰ کاظم کو رہا کرانے کی کوشش نہ کرے دو محملیں تیار کرائیں ایک میں امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کو سوار کیا اور اس کو ایک بڑی فوجی جمعیت کے حلقہ میں بصرہ روانہ کیا اور دوسری محمل جو خالی تھی، اسے بھی اتنی ہی جمعیت کی حفاظت میں بغداد روانہ کیا۔ مقصد یہ تھا کہ آپ کے محل قیام اور قید کی جگہ کو بھی مشکوک بنا دیا جائے۔ یہ نہایت حسرت ناک واقعہ تھا کہ امام کے اہل حرم اور بچے وقت رخصت آپ کو دیکھ بھی نہ سکے۔ اور اچانک محل سرا میں صرف یہ اطلاع پہنچ سکی کہ حضرت سلطنت وقت کی طرف سے قید کر لیے گئے۔ اس سے بی بیوں اور بچوں میں کہرام برپا ہو گیا۔ اور یقیناً امام کے دل پر بھی اس کا جو صدمہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ مگر آپکے ضبط و صبر کی طاقت کے سامنے ہر مشکل آسان تھی۔

معلوم نہیں کتنے ہیر پھیر سے یہ راستہ طے کیا گیا تھا کہ پورے ایک مہینہ سترہ روز

کے بعد سات ذی الحجہ کو آپ بصرہ پہنچائے گئے۔ کامل ایک سال تک آپ بصرہ میں قید رہے۔ یہاں کا حاکم ہارون کا چچازاد بھائی عیسیٰ ابن جعفر تھا۔ شروع میں تو اسے صرف بادشاہ کے حکم کی تعمیل مدنظر تھی بعد میں اس نے غور کرنا شروع کیا آخر ان کے قید کیے جانے کا سبب کیا ہے اس سلسلہ میں سکو امام کے حالات اور سیرت زندگی اور اخلاق و اوصاف کی جستجو کا موقع بھی ملا۔ اور جتنا اس نے امام کی سیرت کا مطالعہ کیا اتنا اس کے دل پر آپ کے بلندی اخلاق اور حسن کردار کا اثر قائم ہوتا گیا اپنے ان تاثرات سے اس نے ہارون کو مطلع بھی کر دیا۔ ہارون پر اسکا الٹا اثر ہوا کہ عیسیٰ کے متعلق بدگمانی پیدا ہو گئی اس لیے اس نے امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کو بغداد میں بلا بھیجا اور فضل ابن ربیع کی حراست میں سپرد کر دیا اور پھر فضل کا رجحان شیعیت کی طرف محسوس کر کے یحییٰ برمکی کو اس کے بجائے مقرر کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ امام کے اخلاق و اوصاف کی کشش ہر ایک پر اپنا اثر ڈالتی تھی۔ اس لیے ظالم بادشاہ کو نگرانوں کی تبدیلی کی ضرورت پڑتی تھی۔

**وفات**۔ سب سے آخر میں امام سندی ابن شاہک کے قید خانہ میں رکھے گئے یہ شخص بہت ہی بے رحم اور سخت دل تھا۔ آخر اسی قید میں حضرت کو انگور میں زہر دیا گیا۔ ۲۵ رجب ۱۸۳ھ میں ۵۵ سال کی عمر میں حضرت کی وفات ہوئی۔ بعد وفات آپ کی نعش کے ساتھ بھی کوئی اعزاز کی صورت اختیار نہیں کی گئی۔ بلکہ حسرت ناک طریقے پر توہین آمیز الفاظ کے ساتھ اعلان کرتے ہوئے آپ کی لاش کو قبرستان کی طرف روانہ کیا گیا۔ مگر اب ذرا عوام میں احساس پیدا ہو گیا تھا اس لیے کچھ اشخاص نے امام کے جنازے کو لے لیا اور پھر عزت و احترام کے ساتھ مشایعت کر کے بغداد سے باہر اس مقام پر جو اب کاظمین کے نام سے مشہور ہے دفن کیا۔

# آٹھویں امام

# حضرت علی رضا علیہ السّلام

**نام و نسب** علیؑ نام رضا لقب اور ابوالحسن کنیت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام والد بزرگوار تھے اور اس لیے آپ کو پورے نام و لقب کے ساتھ یاد کیا جائے۔ تو امام ابوالحسن علی بن موسیٰ الرضا علیہ السّلام کہا جائے گا والدہ گرامی کی کنیت ام البنین اور لقب طاہرہ تھا نہایت عبادت گزار بی بی تھیں۔

**ولادت** ۱۱ ذی القعدہ ۱۴۸ھ میں مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی اس کے تقریباً ایک ماہ قبل ۱۵ شوال کو آپ کے جد بزرگوار امام جعفر صادق علیہ السّلام کی وفات ہو چکی تھی۔ اتنے عظیم حادثہ مصیبت کے بعد جلد ہی اس مقدّس مولود کے دنیا میں آجانے سے یقیناً تمام گھرانے میں ایک سکون اور تسلّی محسوس کی گئی۔

**تربیت** آپ کی نشو و نما اور تربیت اپنے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السّلام کے زیر سایہ ہوئی۔ اور اسی مقدّس ماحول میں بچپنا اور جوانی کی متعدد منزلیں طے ہوئیں۔ اور ۳۵ پینتیس برس کی عمر پوری ہوئی۔ اگرچہ آخری چند سال اس مدّت کے وہ تھے۔ جب امام موسیٰؑ کاظم عراق میں قید و ظلم کی سختیاں برداشت کر رہے تھے مگر اس سے پہلے ۲۸ یا ۲۹ برس آپ کو برابر اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔

**جانشینی**

امام موسیٰ کاظمؑ کو معلوم تھا کہ حکومت وقت آپ کو آزادی سے سانس نہ لینے دیگی۔ اور ایسے حالات پیش آجائیں گے کہ آپ کے آخری عمر کے حصے میں اور دنیا کو چھوڑنے کے موقع پر دوستانِ اہلبیت کا آپ سے ملنا یا بعد کے لیے رہنما کا دریافت کرنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ اس لیے آپ نے اُنہی آزادی کے دنوں اور سکون کے اوقات میں جبکہ آپ مدینہ میں تھے پیروانِ اہلبیت کو اپنے بعد ہونے والے امام سے روشناس بنانے کی ضرورت محسوس فرمائی۔ چنانچہ اولادِ علی و فاطمہ میں سے سترہ آدمی جو ممتاز حیثیت رکھتے تھے جمع فرما کر اپنے فرزند حضرت علی رضاؑ کی وصایت اور جانشینی کا اعلان فرمادیا۔ اور ایک وصیت نامہ تحریراً بھی مکمل فرمایا جس پر مدینہ کے معززین میں سے ساٹھ آدمیوں کی گواہی لکھی گئی۔ یہ اہتمام دوسرے آئمہؑ کے یہاں نظر نہیں آتا۔ صرف اُن خصوصی حالات کی بنا پر جن سے دوسرے آئمہ اپنی وفات کے موقع پر دوچار نہیں ہونے والے تھے۔

**دورِ امامت**

حضرت امام رضا علیہ السّلام کی پینتیس برس کی عمر تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کی وفات ہوئی اور امامت کی ذمہ داریاں آپ کی طرف منتقل ہوئیں۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب بغداد میں ہارون رشید تخت خلافت پر تھا اور بنی فاطمہ کے لیے حالات بہت ناساز گار تھے۔ اس ناخوشگوار ماحول میں حضرت نے خاموشی کے ساتھ شریعت حقہ کے خدمات انجام دینا شروع کر دیے۔

**علمی کمال**

آلِ محمدؐ کے اس سلسلہ میں ہر فرد حضرت احدیت کی طرف سے بلند ترین علم کے درجہ پر قرار دی گئی تھی جسے دوست اور دشمن

سب کو ماننا پڑتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کو علمی فیوض پھیلانے کا زمانہ نے کم موقع دیا اور کسی کو زیادہ۔ چنانچہ ان حضرات میں سے امام جعفر صادقؑ کے بعد اگر کسی کو سب سے زیادہ موقع حاصل ہوا ہے تو وہ امام رضا علیہ السلام ہیں۔ جب آپ امامت کے منصب پر نہیں پہنچے تھے اس وقت حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اپنے تمام فرزندوں اور خاندان کے لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ "تمہارے بھائی علی رضا عالم آل محمدؐ ہیں۔ اپنے دینی مسائل کو اُن سے دریافت کر لیا کرو اور جو کچھ وہ کہیں اُسے یاد رکھو اور پھر حضرت موسیٰ کاظمؑ کی وفات کے بعد جب آپ مدینہ میں تھے اور روضۂ رسولؐ پر تشریف فرما رہتے تھے تو علمائے اسلام مشکل مسائل میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ محمد ابن عیسیٰ الیقطینی کا بیان ہے کہ میں نے ان تحریری مسائل کو جو حضرت امام رضاؑ سے پوچھے گئے تھے۔ اور آپ نے ان کا جواب تحریر فرمایا تھا اکٹھا کیا تو اٹھارہ ہزار کی تعداد میں تھے۔

## زندگی کے مختلف دور

حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کے بعد دس برس ہارون کا دور رہا۔ یقیناً وہ امام رضاؑ کے وجود کو بھی دنیا میں اسی طرح برداشت نہیں کر سکتا تھا جس طرح اس سے پہلے آپ کے والد بزرگوار کا رہنا اس نے گوارہ نہیں کیا۔ مگر یا تو امام موسیٰ کاظمؑ کے ساتھ جو طویل مدت تک تشدد اور ظلم ہوتا رہا اور جس کے نتیجہ میں قید خانہ ہی کے اندر آپ دنیا سے رخصت ہو گئے اس سے حکومت وقت کی عام بدنامی ہو گئی تھی اور یا واقعی ظالم کو خود اپنی بدسلوکیوں کا احساس اور ضمیر کی طرف سے ملامت کی کیفیت تھی جس کی وجہ سے کھلم کھلا امام رضاؑ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔

یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ایک دن یحییٰ ابن خالد برمکی نے اپنے اثر اور رسوخ کے بڑھانے کے لیے یہ کہا بھی کہ علیؑ ابن موسیٰؑ بھی اب اپنے باپ کے بعد امامت کے اسی طرح دعویدار ہیں۔ تو ہارون نے جواب دیا کہ جو کچھ ہم نے اُن کے باپ کے ساتھ کیا وہی کیا کم ہے جو اب تم چاہتے ہو کہ میں اس نسل ہی کا خاتمہ کر دوں۔

پھر بھی ہارون رشید کا اہلبیت رسولؐ سے شدید اختلاف اور سادات کے ساتھ جو برتاؤ اب تک رہا تھا اس کی بنا پر عام طور سے عمال حکومت یا عام افراد بھی جنھیں حکومت کو راضی رکھنے کی خواہش تھی اہلبیتؑ کے ساتھ کوئی اچھا رویہ رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اور نہ امام کے پاس آزادی کے ساتھ لوگ استفادہ کیلئے آ سکتے تھے۔ نہ حضرت کو سچے اسلامی احکام کی اشاعت کے مواقع حاصل تھے۔

ہارون کا آخری زمانہ اپنے دونوں بیٹوں امین اور مامون کی باہمی رقابتوں سے بہت بے لطفی میں گذرا۔ امین پہلی بیوی سے تھا جو خاندان شاہی سے منصور دوانیقی کی پوتی تھی۔ اور اس لیے عرب سردار سب اس کے طرفدار تھے۔ اور مامون ایک عجمی کنیز کے پیٹ سے تھا۔ اس لیے دربار کا عجمی طبقہ اس سے محبت رکھتا تھا۔ دونوں کی آپس کی رسہ کشی ہارون کے لیے سوہان روح بنی رہتی تھی۔ اس نے اپنے خیال میں اس کا تصفیہ مملکت کی تقسیم کے ساتھ یوں کر دیا کہ دارالسلطنت بغداد اور اس کے چاروں طرف کے عربی حصے جیسے شام۔ مصر۔ حجاز۔ یمن وغیرہ محمد امین کے نام کیے گئے اور مشرقی ممالک جیسے ایران۔ خراسان۔ ترکستان وغیرہ مامون کے لیے مقرر کیے۔ مگر یہ تصفیہ تو اسی وقت کارگر ہو سکتا تھا جب دونوں فریق جو اور جتنا

کے اصول پر عمل کرتے ہوتے۔

لیکن جہاں اقتدار کی ہوس کارفرما ہو وہاں اگر بنی عباس کے ہاتھوں بنی فاطمہ کے خلاف ہر طرح کے ظلم و تعدی کی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے تو خود بنی عباس ہیں ایک گھر کے اندر دو بھائی اگر ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں تو کیوں نہ ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ کارروائیاں کرنے پر تیار نظر آئے۔ اور کیوں نہ ان طاقتوں میں باہم تصادم ہو جبکہ ان میں سے کوئی اس ہمدردی اور ایثار اور خلق خدا کی خیر خواہی کا بھی حامل نہیں ہے۔ جیسے بنی فاطمہ اپنے پیش نظر رکھکر اپنے واقعی حقوق سے چشم پوشی کر لیا کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ادھر ہارون کی آنکھ بند ہو گئی اور اُدھر بھائیوں میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ آخر چار برس کی مسلسل کشمکش اور طویل خوں ریزی کے بعد مامون کو کامیابی ہوئی اور اُس کا بھائی امین محرم ۱۹۸ھ میں تلوار کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ اور مامون کی خلافت تمام بنی عباس کے حدود سلطنت پر قائم ہو گئی۔

**ولی عہدی**

امین کے قتل ہونے کے بعد سلطنت تو مامون کے پائے نام ہو گئی۔ مگر یہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ امین ننھیال کی طرف سے عربی النسل تھا اور مامون عجمی النسل۔ امین کے قتل ہونے سے عراق کی عرب قوم اور ارکان سلطنت کے دل مامون کی طرف سے صاف نہیں ہو سکتے تھے۔ بلکہ ایک غم و غصہ کی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ دوسری طرف خود بنی عباس میں سے ایک بڑی جماعت جو امین کی طرفدار تھی اس سے بھی مامون کو ہر وقت خطرہ لگا ہوا تھا اولاد فاطمہ میں سے بہت سے لوگ جو وقتاً فوقتاً بنی عباس کے مقابل میں کھڑے ہوتے

رہے تھے وہ خواہ قتل کر دیئے گئے ہوں یا جلاوطن کیے گئے ہوں یا قید رکھے گئے ہوں ان کے بھی موافق ایک جماعت تھی جو اگر حکومت کا کچھ بگاڑ نہ بھی سکتی۔ تب بھی دل ہی دل میں حکومت بنی عباس سے بیزار ضرور تھی۔

ایران میں ابو مسلم خراسانی نے بنی اُمیہ کے خلاف جو اشتعال پیدا کیا تھا وہ ان مظالم ہی کو یاد دلا کر جو بنی اُمیہ کے ہاتھوں حضرت امام حسین علیہ السّلام اور دوسرے بنی فاطمہ کے ساتھ ہوئے تھے اُس سے ایران میں اس خاندان کیساتھ ہمدردی کا پیدا ہونا فطری تھا۔ درمیان میں بنی عباس نے اس سے غلط فائدہ اٹھایا۔ مگر اتنی مدت میں کچھ نہ کچھ تو ایرانیوں کی آنکھیں بھی کھُلی ہی ہوں گی کہ ہم سے کہا گیا تھا اور اقتدار کن لوگوں نے حاصل کر لیا۔ ممکن ہے کہ ایرانی قوم کے ان رجحانات کا چرچہ مامون کے کانوں تک بھی پہنچا ہو۔ اب جس وقت کہ امین کے قتل کے بعد وہ عرب قوم پر اور بنی عباس کے خاندان پر بھروسہ نہیں کر سکتا تھا اور اسے ہر وقت اس حلقہ سے بغاوت کا اندیشہ تھا۔ تو اسے سیاسی مصلحت اسی میں معلوم ہوئی کہ عرب کے خلاف عجم اور بنی عباس کے خلاف بنی فاطمہ کو اپنا بنایا جائے اور چونکہ طرز عمل میں خلوص سمجھا نہیں جا سکتا اور وہ عالم طبائع پر اثر نہیں ڈال سکتا اگر یہ نمایاں ہو جائے کہ وہ سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ہے۔ اس لیے ضرورت ہوئی کہ مامون مذہبی حیثیت سے اپنی شیعیت اور ولائے اہلبیت کے چرچے عوام کے حلقوں میں پھیلائے اور یہ دکھلائے کہ وہ انتہائی نیک نیتی سے "حق بحق دار رسید" کے مقولہ کو سچا بنانا چاہتا ہے۔

اس سلسلہ میں جیسا کہ جناب شیخ صدوق اعلی اللہ مقامہ نے تحریر فرمایا ہے

اس نے اپنی نذر کی حکایت بھی تشہر کی کہ جب امین کا اور میرا مقابلہ تھا اور بہت نازک حالت تھی اور عین اُسی وقت میرے خلاف سیستان اور کرمان میں بھی بغاوت ہو گئی تھی اور خراسان میں بھی بے چینی پھیلی ہوئی تھی اور میری مالی حالت بھی ابتر تھی اور فوج کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا تو اس سخت اور دشوار ماحول میں میں نے خدا سے التجا کی اور منّت مانی کہ اگر یہ سب جھگڑے ختم ہو جائیں اور میں خلافت تک پہونچوں تو اس کو اس کے اصلی حقدار یعنی اولاد فاطمہ میں سے جو اس کا اہل ہے اس تک پہونچا دوں گا۔ اسی نذر کے بعد سے میرے سب کام بننے لگے اور آخر تمام دشمنوں پر مجھے فتح حاصل ہوئی۔

یقیناً یہ واقعہ مامون کی طرف سے اس لیے بیان کیا گیا کہ اس کا طرزِ عمل خلوصِ قلب اور حسنِ نیت پر مبنی سمجھا جائے۔ یوں تو اہلبیتؑ کے جو کھلے ہوئے سخت سے سخت دشمن تھے۔ وہ بھی ان کی حقیقت اور فضیلت سے واقف تھے ہی اور ان کی عظمت کو جانتے تھے مگر شعیت کے معنی صرف یہ جاننا تو نہیں ہیں۔ بلکہ محبت رکھنا اور اطاعت کرنا ہیں اور مامون کے طرزِ عمل سے یہ ظاہر ہے کہ وہ اس دعوائے شعیت اور محبت اہلبیت کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود خود امام کی اطاعت نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ امام کو اپنے منشاء کے مطابق چلانے کی کوشش تھی۔ ولیعہد بننے کے بارے میں آپ کے اختیارات کو بالکل سلب کر دیا گیا اور آپ کو مجبور بنا دیا گیا تھا اس سے ظاہر ہے کہ یہ ولی عہدی تفویض بھی ایک حاکمانہ تشدد تھا جو اس وقت شعیت کے بھیس میں امام کے ساتھ کیا جا رہا تھا۔

امام علیہ السّلام کا اس ولی عہدی کو قبول کرنا۔ بالکل ایسا ہی تھا جیسا ہارون

کے حکم سے امام موسیٰ کاظم کا جیل خانہ چلا جانا۔ اسی لیے جب امام رضا مدینہ منورہ سے خراسان کی طرف روانہ ہو رہے تھے تو آپ کے رنج صدمہ اور اضطراب کی کوئی حد نہ تھی روضۂ رسولؐ سے رخصت کے وقت آپ کا وہی عالم تھا جو حضرت امام حسینؑ کا مدینہ سے روانگی کے موقع پر تھا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آپ بیتابانہ روضہ کے اندر جاتے ہیں اور نالہ و آہ کے ساتھ اُمت کی شکایت کرتے ہیں۔ پھر باہر نکل کر گھر جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور پھر دل نہیں مانتا پھر روضہ سے جا کر لپٹ جاتے ہیں یہی صورت کئی مرتبہ ہوئی۔ راوی کا بیان ہے کہ میں حضرت کے قریب گیا تو فرمایا اے محوّل میں اپنے جدّ امجد کے روضہ سے بہ جبر جدا کیا جا رہا ہوں اب مجھ کو یہاں واپس آنا نصیب نہ ہوگا۔

۲۰۰ھ میں حضرت مدینہ منورہ سے خراسان کی جانب روانہ ہوئے اہل عیال اور متعلقین سب کو مدینہ ہی میں چھوڑ گئے اس وقت امام محمد تقی علیہ السلام کی عمر پانچ برس کی تھی آپ بھی مدینہ ہی میں رہے جب حضرت مرو پہنچے جو اس وقت دارالسلطنت تھا تو مامون نے چند روز ضیافت و تکریم کے مراسم ادا کرنے کے بعد قبول خلافت کا سوال پیش کیا، حضرت نے اس سے اسی طرح انکار کیا جس طرح امیرالمومنینؑ چوتھے موقع پر خلافت پیش کیے جانے کے وقت انکار فرما رہے تھے مامون کو خلافت سے دست بردار ہونا درحقیقت منظور نہ تھا ورنہ وہ امام کو اسی پر مجبور کرتا۔ چنانچہ جب حضرتؑ نے خلافت کے قبول کرنے سے انکار فرمایا تو اس نے ولی عہدی کا سوال پیش کیا۔ حضرتؑ اس کے بھی انجام سے واقف تھے۔ نیز بخوشی جابر حکومت

اس سے بھی انکار فرمایا۔ مگر اس پر مامون کا اصرار جبر کی حد تک پہنچ گیا اور اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر آپ اس کو منظور نہیں کر سکتے تو آپ کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

جان کا خطرہ قبول کیا جا سکتا ہے جب مذہبی مفاد کا قیام جان دینے پر موقوف ہو ورنہ حفاظت جان شریعت اسلام کا بنیادی حکم ہے۔ امام نے فرمایا یہ ہے تو میں مجبوراً قبول کرتا ہوں، مگر کاروبار سلطنت میں بالکل دخل نہ دوں گا۔ ہاں اگر کسی بات میں مجھ سے مشورہ لیا جائے گا تو نیک مشورہ ضرور دوں گا۔ اس کے بعد یہ ولی عہدی صرف برائے نام سلطنت وقت کے ایک ڈھکوسلے سے زیادہ کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ جس سے ممکن ہے کچھ عرصہ تک کسی سیاسی مقصد میں کامیابی حاصل کر لی گئی ہو۔ مگر امام کی حیثیت اپنے فرائض کے انجام دینے میں بالکل وہ تھی جو اُن کے پیش رو حضرت علی مرتضیٰ اپنے زمانہ کی با اقتدار طاقتوں کے ساتھ اختیار کر چکے تھے۔ جس طرح اُن کا کبھی کبھی مشورہ دیدینا اُن حکومتوں کو صحیح و جائز نہیں بنا سکتا تھا ویسے ہی امام رضا کا اس نوعیت سے ولی عہدی کا قبول فرمانا اس سلطنت کے جواز کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ صرف مامون کی ایک راج ہٹ تھی جو اس طرح پوری ہو گئی۔ مگر امام نے اپنے دامن کو سلطنت، ظلم کے اقدامات اور نظم و نسق سے بالکل الگ رکھا۔

بنی عباس مامون کے اس فیصلے سے قطعاً متفق نہ تھے۔ انھوں نے بہت کچھ دراندازیاں کیں، مگر مامون نے صاف کہہ دیا کہ علی رضا سے بہتر کوئی دوسرا شخص تم بتا دو۔ اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ اس سلسلہ میں بڑے بڑے مناظرے

بھی ہوئے۔ مگر ظاہر ہے کہ امام کے مقابلے میں کس کی علمی فوقیت ثابت ہوسکتی تھی مامون کا فیصلہ اٹل تھا۔ اور وہ اس سے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھا۔ نہ کوئی دوسرا دلائل سے اُسے قائل کرسکتا تھا کہ وہ اپنے فیصلہ کو بدل دیتا۔

یکم ماہ رمضان ۲۰۱ھ روز پنجشنبہ جلسۂ ولی عہدی منعقد ہوا۔ بڑی شان وشوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریب عمل میں لائی گئی۔ سب سے پہلے مامون نے اپنے بیٹے عباس کو اشارہ کیا اور اس نے بیعت کی پھر اور لوگ بیعت سے مشرف یاب ہوئے۔ سونے اور چاندی کے سکے سر مبارک پر نثار کیے گئے اور تمام ارکان سلطنت وملازمین کو انعامات تقسیم ہوئے۔ مامون نے حکم دیا کہ حضرت کے نام کا سکہ تیار کیا جائے۔ چنانچہ درہم و دینار پر حضرت کے نام کا نقش ہوا اور تمام قلمرو میں وہ سکہ چلایا گیا جمعہ کے خطبہ میں حضرت کا نام داخل کیا گیا۔

## اخلاق واوصاف

مجبوری اور بے بسی کا نام قناعت یا درویشی رہ عصمت بی بی از بے چادری کا کے مقولہ کے موافق اکثر ابنائے دنیا کا شعار رہتا ہے مگر ثروت واقتدار کے ساتھ فقیرانہ زندگی اختیار کرنا بلند مرتبہ مردان خدا کا حصہ ہے۔ اہلبیت معصومینؑ میں سے جو بزرگوار ظاہری حیثیت سے اقتدار کے درجہ پر نہ تھے اور اکثر یہ حضرات ایسے ہی تھے وہ عموماً اچھے لباس اور شان کے ساتھ رہتے تھے۔ کیونکہ ان کی فقیری کو دشمن بے بسی پر محمول کرکے طعن وتشنیع پر آمادہ ہوتے اور حقانیت کے دقار کو ٹھیس لگتی مگر جو بزرگ اتفاقاتِ روزگار سے ظاہری اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے۔ انھوں نے اتنا ہی فقر اور سادگی کے مظاہرہ میں اضافہ کر دیا تاکہ ان کی زندگی غریبوں

مسلمانوں کی تسلی کا ذریعہ بنے اور ان کے لیے نمونہ عمل ہو۔ جیسے امیرالمومنین حضرت علی مرتضیٰؑ چونکہ شہنشاہ اسلام مانے جا رہے تھے۔ اس لیے آپ کا لباس اور طعام ویسا زاہدانہ تھا جس کی مثال دوسرے معصومینؑ کے یہاں نہیں ملتی۔ یہی صورت حضرت علی رضاؑ کی تھی۔ آپ مسلمانوں کی اُس عظیم الشان سلطنت کے ولی عہد بنائے گئے تھے جس کے وسعت مملکت کے سامنے روم و فارس کا ذکر بھی طاقِ نسیاں کی نذر ہو گیا تھا جہاں اگر بادل سامنے سے گزرتا تھا تو خلیفہ کی زبان سے آواز بلند ہوتی تھی کہ "جا جہاں تجھے برسنا ہو برس۔ بہرحال تیری پیداوار کا خراج میرے ہی پاس آئے گا"

حضرت امام رضاؑ کا اس سلطنت کی ولی عہدی پر فائز ہونا دنیا کے سامنے ایک نمونہ تھا کہ دین والے اگر دنیا کو پا جائیں تو ان کا رویہ کیا ہو گا۔ یہاں امام رضاؑ کو اپنی دینی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے ضرورت تھی کہ زاہد اور ترک دنیا کے مظاہرے اتنے ہی نمایاں تر بنا دیں۔ جتنے ترک و احتشام کے دنیاوی تقاضے زیادہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ نے اپنے کو دہرا دیا اور علی رضاؑ کے لباس میں علی مرتضیٰؑ کی سیرت دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ گئی۔ آپ نے اپنی دولت سرا میں قیمتی قالین بچھانا پسند نہیں کیے بلکہ جاڑے میں بالوں کا کمل اور گرمی میں چٹائی کا فرش ہوا کرتا تھا۔ کھانا سامنے لایا جاتا تو دربان، سائیس اور تمام غلاموں کو بلا کر اپنے ساتھ کھانے میں شریک فرماتے تھے۔ داب آداب شاہی کے خوگر ایک بلخی شخص نے ایک دن کہہ دیا کہ حضور اگر ان لوگوں کے کھانے کا انتظام الگ ہو جایا کرے تو کیا ہرج ہے۔ حضرت نے فرمایا: "خالق سب کا اللہ ہے۔ ماں سب کی حواؑ اور باپ سب کے آدمؑ ہیں۔ جزا و سزا ہر ایک کی اس کے عمل کے مطابق ہو گی۔ پھر دنیا میں تفرقہ کس لیے ہو"

اسی عباسی سلطنت کے ماحول کا ایک جزو بن کر جہاں صرف پیغمبرؐ کی طرف ایک قرابت داری کی نسبت کے سبب اپنے کو خلق خدا پر حکمرانی کا حقدار بتایا جاتا تھا اور اس کے ساتھ کبھی اپنے اعمال و افعال پر نظر نہ کی جاتی تھی کہ ہم کیسے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہیئے۔ یہاں تک کہ یہ کہا جانے لگا کہ بنی عباس ظلم و ستم اور فسق و فجور میں بنی اُمیّہ سے کم نہ رہے بلکہ بعض باتوں میں اُن سے آگے بڑھ گئے اور اُس کے ساتھ پھر بھی قرابت رسُولؐ پر افتخار تھا۔ اس ماحول کے اندر داخل ہو کر امام رضاؑ کا اس بات پر بڑا زور دینا کہ قرابت کوئی چیز نہیں اصل انسان کا عمل ہے۔ بہ ظاہر صرف ایک شخص کا اظہار فروتنی اور انکسار نفس تھا جو بہر حال ایک اچھی صفت ہے لیکن حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تقریبًا ایک صدی کی عباسی سلطنت کی پیدا کی ہوئی ذہنیت کے خلاف اسلامی نظریہ کا اعلان تھا اور اس حیثیت سے بڑا اہم ہو گیا تھا کہ وہ اب اسی سلطنت کے ایک رُکن کی طرف سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ امام رضاؑ کی سیرت میں اس کے مختلف شواہد ہیں۔ ایک شخص نے حضرت کی خدمت میں عرض کی کہ "خدا کی قسم آباؤ اجداد کے اعتبار سے کوئی شخص آپ سے افضل نہیں" حضرت نے فرمایا۔ میرے آباؤ اجداد کو جو شرف حاصل ہوا وہ بھی صرف تقویٰ، پرہیزگاری اور اطاعت خدا سے" ایک شخص نے کسی دن کہا کہ "واللہ آپ بہترین خلق ہیں" حضرت نے فرمایا "اے شخص حلف نہ اٹھا جس کا تقویٰ و پرہیزگاری مجھ سے زیادہ ہو وہ مجھ سے افضل ہے"

ابراہیم بن عباس کا بیان ہے کہ حضرت فرماتے تھے "میرے تمام لونڈی غلام آزاد ہو جائیں اگر اس کے سوا کچھ اور ہو کہ میں اپنے کو محض رسول اللہؐ کی

قرابت کی وجہ سے اِس سیاہ رنگ غلام سے بھی افضل نہیں جانتا۔ حضرت نے اشارہ کیا اپنے ایک غلام کی جانب، ہاں جب عمل خیر بجالاؤں تو اللہ کے نزدیک اس سے افضل ہوں گا۔

یہ باتیں کوتاہ نظر لوگ صرف ذاتی انکسار پر محمول کر لیتے ہوں۔ مگر خود حکومت عباسیہ کا فرمانروا یقیناً اتنا کُند ذہن نہ ہوگا کہ وہ ان تازیانوں کو محسوس نہ کرے۔ جو امام رضاؑ کے خاموش افعال اور اس طرح کے اقوال سے اُس کے خاندانی نظامِ سلطنت پر برابر لگ رہے تھے۔ اُس نے تو بخیال خود ایک وقتی سیاسی مصلحت سے اپنی سلطنت کو مستحکم بنانے کے لیے حضرت کو ولی عہد بنایا تھا مگر بہت جلد اُسے محسوس ہوا کہ اگر ان کی زندگی زیادہ عرصے تک قائم رہی تو عوام کی ذہنیت میں یک لخت انقلاب ہو جائے گا اور عباسی سلطنت کا تخت ہمیشہ کے لیے الٹ جائے گا۔

## عزائے حسینؑ کی اشاعت

اب امام رضاؑ کو تبلیغ حق کے لیے نام حسینؑ کی اشاعت کے کام کو ترقی دینے کا بھی پورا موقع حاصل ہو گیا تھا جس کی بنیاد اس کے پہلے حضرت امام محمدؑ باقر اور امام جعفر صادقؑ قائم کر چکے تھے۔ مگر وہ زمانہ ایسا تھا کہ امام کی خدمت میں وہی لوگ حاضر ہوتے تھے جو بحیثیت امام یا بحیثیت عالم دین آپ کے ساتھ عقیدت رکھتے تھے اور اب امام رضاؑ تو امام روحانی بھی ہیں اور ولی عہد سلطنت بھی۔ اس لیے آپ کے دربار میں حاضر ہونے والوں کا دائرہ وسیع ہے مرو کا مقام ہے جو ایران کے تقریباً وسط میں واقع ہے۔ ہر طرف کے لوگ

یہاں آتے ہیں اور یہاں یہ عالم کہ ادھر محرم کا چاند نکلا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دوسروں کو بھی ترغیب و تحریص کی جانے لگی کہ آلِ محمدؐ کے مصائب کو یاد کرو اور تاثراتِ غم کو ظاہر کرو۔

یہ بھی ارشاد ہونے لگا کہ "جو اُس مجلس میں بیٹھے جہاں ہماری باتیں زندہ کی جاتی ہیں۔ اُس کا دل مردہ نہ ہو گا اس دن کہ جب سب کے دل مردہ ہوں گے۔" تذکرہ امام حسینؑ کے لیے جو مجمع ہو اُس کا نام اصطلاحی طور پر "مجلس" اسی امام رضاؑ کی حدیث ہی سے ماخوذ ہے۔ آپ نے عملی طور پر بھی خود مجلسیں کرنا شروع کر دیں۔ جن میں کبھی خود ذاکر ہوئے۔ اور دوسرے سامعین جیسے ریّان بن شبیب کی حاضری کے موقع پر جو آپ نے مصائب امام حسینؑ بیان فرمائے اور کبھی عبد اللہ بن ثابت یا دعبل خزاعی ایسے کسی شاعر کی حاضری کے موقع پر اس شاعر کو حکم ہوا کہ تم ذکرِ امام حسینؑ میں اشعار پڑھو وہ ذاکر ہوا اور حضرت سامعین میں داخل ہوئے۔

دعبل کو حضرت نے بعد مجلس ایک قیمتی حلہ بھی مرحمت فرمایا جس کے لینے میں دعبل نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ مجھے قیمتی حُلّہ کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے جسم کا اُترا ہوا لباس مرحمت فرمائیے تو حضرت نے اُن کی خوشی پوری کی۔ وہ حلہ تو انھیں دیا ہی۔ اُس کے علاوہ ایک جُبّہ اپنے پہننے کا بھی مرحمت فرمایا۔

اس سے ذاکر کا بلند طریقہ کار کہ اُسے کسی دنیاوی انعام کی خاطر یا معاوضہ اجرت طے کر کے ذاکری نہیں کرنا چاہیئے۔ اور بانی مجلس کا طریقہ کار کہ وہ بغیر طے کیے ہوئے کچھ بطور پیش کش ذاکر کی خدمت میں پیش کرے۔ دونوں

اثر ثابت ہیں مگر ان مجالس میں سامعین کے اندر کسی حصّہ کی تقسیم ہرگز کسی معتبر کتاب سے ثابت نہیں ہوتی۔

**وفات** مامون کے توقعات غلط ثابت ہونے ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ آخر امام کی جان لینے کا درپے ہو گیا اور وہی خاموش حربہ جو ان معصومینؑ کے ساتھ اس کے پہلے بہت دفعہ استعمال کیا جا چکا تھا کام میں لایا گیا۔ انگوروں میں جو بطور تحفہ امام کے سامنے پیش کیے گئے تھے۔ زہر دیا گیا اور اُس کے اثر سے ۱۷ صفر ۲۰۳ھ میں حضرت نے شہادت پائی۔ مامون نے بظاہر بہت رنج و ماتم کا اظہار کیا اور بڑے شان و شکوہ کے ساتھ اپنے باپ ہارون رشید کے قریب دفن کیا۔

جہاں مشہد مقدس میں حضرت کا روضہ آج تاجداران عالم کی جبیں سائی کا مرکز بنا ہوا ہے وہیں اپنے وقت کا بزرگ ترین دنیاوی شہنشاہ ہارون رشید بھی دفن ہے۔ جس کا نام و نشان تک وہاں جانے والوں کو معلوم نہیں ہوتا۔

# نویں امام
# حضرت محمد تقی علیہ السّلام

**نام ونسب** محمد نام ابو جعفر کنیت اور تقی وجوّاد دونوں مشہور لقب تھے۔ اسی لیے اسم ولقب کو شریک کرکے آپ امام محمد تقی علیہ السّلام کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ چونکہ آپ کے پہلے امام محمد باقر علیہ السّلام کی کنیت ابو جعفر ہوچکی تھی۔ اس لیے کتابوں میں آپ کو ابو جعفر ثانی اور دوسرے لقب کو سامنے رکھ کر حضرت جوّاد بھی کہا جاتا ہے۔ والد بزرگوار آپ کے حضرت امام رضا تھے۔ اور والدہ معظمہ کا نام جناب سبیکہ یا سکینہ تھا۔

**ولادت** ۱۰ رجب ۱۹۵ھ کو مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔ اس وقت بغداد کے دارالسطنت میں ہارون رشید کا بیٹا امین تختِ حکومت پر تھا۔

**نشو ونما اور تربیت** یہ ایک حسرتناک واقعہ ہے کہ امام محمد تقی علیہ السّلام کو نہایت کمسنی ہی کے زمانے میں مصائب اور پریشانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجانا پڑا۔ انھیں بہت ہی کم اطمینان اور سکون کے لمحات میں باپ کی محبّت، شفقت اور تربیت کے سایے میں زندگی گذارنے کا موقع مل سکا۔ آپ کو صرف پانچواں برس تھا۔ جب حضرت امام رضا علیہ السّلام

مدینہ سے خراسان کی طرف سفر کرنے پر مجبور ہوئے۔ امام محمد تقی علیہ السّلام اسوقت ے جو اپنے باپ سے جدا ہوئے تو پھر زندگی میں ملاقات کا موقع نہ ملا۔ امام محمد تقیؑ سے جدا ہونے کے تیسرے سال امام رضاؑ کی وفات ہوگئی۔ دنیا سمجھتی ہوگی کہ امام محمد تقیؑ کے لیے علمی اور عملی بلندیوں تک پہونچنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہا۔ اس لیے اب امام جعفر صادقؑ کی علمی مسند شاید خالی نظر آئے۔ مگر خلق خدا کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس کمسن بچے کو تھوڑے دن بعد مامون کے پہلو میں بیٹھکر بڑے بڑے علماء سے فقہ، حدیث تفسیر اور کلام پر مناظرے کرتے اور سب کو قائل ہو جاتے دیکھا۔ ان کی حیرت اسوقت تک دور ہونا ممکن نہ تھی جب تک وہ مادی اسباب کے آگے ایک مخصوص خداوندی مدرسہ تعلیم و تربیت کے قائل نہ ہوتے، جس کے بغیر یہ معمّہ نہ حل ہوا اور نہ کبھی حل ہو سکتا ہے۔

## عراق کا پہلا سفر

جب امام رضا علیہ السّلام کو مامون نے ولی عہد بنایا اور اس کی سیاست اس کی مقتضی ہوئی کہ بنی عباس کو چھوڑ کر بنی فاطمہ سے روابط قائم کیے جائیں اور اس طرح شیعیان اہل بیتؑ کو اپنی جانب مائل کیا جائے تو اُس نے ضرورت محسوس کی کہ خلوص و اتحاد کے مظاہرے کے لیے علاوہ اس قدیم رشتے کے جو ہاشمی خاندان میں سے ہونے کی وجہ سے ہے۔ کچھ جدید رشتوں کی بنیاد بھی قائم کر دی جائے۔ چنانچہ اسی جلسہ میں جہاں ولی عہدی کی رسم ادا کی گئی اس نے اپنی بہن ام حبیبہ کا عقد امام رضاؑ کے ساتھ کیا اور اپنی بیٹی ام الفضل کی نسبت کا امام محمد تقیؑ کے ساتھ اعلان کیا۔ غالباً

اُس کا خیال تھا کہ اس طرح امام رضا بالکل اپنے بنائے جا سکیں گے۔ مگر جب اُس نے محسوس کیا کہ یہ اپنے ان منصبی فرائض کو جو رسُول کے وارث ہونے کی بنا پر ان کے ذمہ ہیں کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے اور اب عباسی سلطنت کا رکن ہونے کے ساتھ ان اصول پر قائم رہنا مدینہ کے محلہ بنی ہاشم میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرنے سے کہیں زیادہ خطرناک ہے تو اسے اپنے مفاد سلطنت کے تحفظ کی خاطر اس کی ضرورت ہوئی کہ وہ زہر دے کر حضرت کی زندگی کا خاتمہ کر دے مگر وہ مصلحت جو امام رضاؑ کو ولی عہد بنانے کی تھی یعنی ایرانی قوم اور جماعت شیعہ کو اپنے قبضے میں رکھنا وہ اب بھی باقی تھی اس لیے ایک طرف تو امام رضاؑ کے انتقال پر اس نے غیر معمولی رنج وغم کا اظہار کیا تاکہ وہ اپنے دامن کو حضرت کے خون ناحق سے الگ ثابت کر سکے اور دوسری طرف اس نے اپنے اس اعلان کی تکمیل ضروری سمجھی جو وہ امام محمد تقیؑ کے ساتھ اپنی لڑکی سے منسوب کرنے کا کر چکا تھا۔ اس نے اس مقصد سے امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے عراق کی طرف بلوایا اس لیے کہ امام رضاؑ کی وفات کے بعد وہ خود خراسان سے اب اپنے خاندان کے پرانے دارالسلطنت بغداد میں آ چکا تھا اور اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ ام الفضل کا عقد اس صاحبزادے کے ساتھ بہت جلد کر دے۔

## علماء سے مناظرہ

بنی عباس کو مامون کی طرف سے امام رضاؑ کا ولی عہد بنایا جانا ہی ناقابل برداشت تھا۔ امام رضاؑ کی وفات سے ایک حد تک انھیں اطمینان حاصل ہوا تھا اور اُنھوں نے مامون سے اپنے حسب دلخواہ اس کے بھائی موتمن کی ولی عہدی کا اعلان بھی کرا دیا۔

جو بعد میں معتصم باللہ کے نام سے خلیفہ تسلیم کیا گیا۔ اس کے علاوہ امام رضاؑ کی ولی عہدی کے زمانے میں عباسیوں کا مخصوص شعار یعنی کالا لباس ترک ہو کر جو سبز لباس کا رواج ہو رہا تھا اسے منسوخ کر کے پھر سیاہ لباس کی پابندی عائد کر دی گئی تاکہ بنی عباس کے روایات قدیمہ محفوظ رہیں۔ یہ سب باتیں عباسیوں کو یقین دلا رہی تھیں کہ وہ مامون پر پورا قابو پا چکے ہیں مگر اب مامون کا یہ ارادہ کہ وہ امام محمد تقیؑ کو اپنا داماد بنائے ان لوگوں کے لیے پھر تشویش کا باعث بنا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے دلی رجحان کو دل میں نہ رکھ سکے اور ایک وفد کی شکل میں مامون کے پاس آ کر اپنے جذبات کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ امام رضاؑ کے ساتھ جو آپ نے طریقہ کار اختیار کیا وہی ہم کو ناپسند تھا مگر خیر وہ کم از کم اپنی عمر اور اوصاف و کمالات کے لحاظ سے قابل عزت سمجھے بھی جا سکتے تھے۔ مگر یہ ان کے بیٹے محمدؑ تو ابھی بالکل کم سن ہیں ایک بچے کو بڑے بڑے علماء اور معززین پر ترجیح دینا اور اسقدر اس کی عزت کرنا ہرگز خلیفہ کے لیے زیبا نہیں ہے۔ پھر ام حبیبہ کا نکاح جو امام رضاؑ کے ساتھ کیا گیا تھا اس سے ہم کو کیا فائدہ پہونچا جو اب ام الفضل کا نکاح محمد ابن علیؑ کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔

مامون نے اس تمام تقریر کا یہ جواب دیا کہ محمد کمسن ضرور ہیں مگر میں نے خوب اندازہ کر لیا ہے کہ اوصاف و کمالات میں وہ اپنے باپ کے پورے جانشین ہیں اور عالم اسلام کے بڑے بڑے علماء جن کا تم حوالہ دے رہے ہو علم میں اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اگر تم چاہو تو امتحان لیکر دیکھ لو۔ پھر تمھیں بھی میرے فیصلے سے متفق

ہونا پڑے گا۔ یہ صرف منصفانہ جواب ہی نہیں بلکہ ایک طرح کا چیلنج تھا جس پر مجبوراً ان لوگوں کو مناظرے کی دعوت منظور کرنا پڑی حالانکہ خود مامون تمام سلاطین بنی عباس میں یہ خصوصیت رکھتا ہے کہ مورخین اس کے لیئے یہ الفاظ لکھ دیتے ہیں۔ کان یعد من کبار الفقہاء یعنی اس کا شمار بڑے فقیہوں میں ہے۔ اس لیئے اس کا فیصلہ خود کچھ کم وقعت نہ رکھتا تھا مگر ان لوگوں نے اس پر اکتفا نہیں کی بلکہ بغداد کے سب سے بڑے عالم یحییٰ ابن اکثم کو امام محمد تقی علیہ السلام سے بحث کے لیئے منتخب کیا۔

مامون نے ایک عظیم الشان جلسہ اس مناظرے کے لیئے منعقد کیا اور عام اعلان کروا دیا۔ ہر شخص اس عجیب اور بظاہر غیر متوازی مقابلے کے دیکھنے کا مشتاق ہو گیا جس میں ایک طرف ایک آٹھ برس کا بچّہ تھا اور دوسری طرف ایک آزمودہ کار اور شہرۂ آفاق قاضی القضاۃ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہر طرف سے خلائق کا ہجوم ہو گیا تھا۔ مورخین کا بیان ہے کہ ارکان دولت اور معززین کے علاوہ اس جلسے میں نو سو کرسیاں فقط علماء و فضلاء کے لیئے مخصوص تھیں اور اس میں کوئی تعجب بھی نہیں اس لیئے کہ یہ زمانہ عباسی سلطنت کے شباب اور بالخصوص علمی ترقی کے اعتبار سے زرّین دوَر تھا اور بغداد دارالسلطنت تھا جہاں تمام اطراف سے مختلف علوم و فنون کے ماہرین کھنچ کر جمع ہو گئے تھے اس اعتبار سے یہ تعداد کسی مبالغہ پر مبنی معلوم نہیں ہوتی۔

مامون نے حضرت امام محمد تقیؑ کے لیئے اپنے پہلو میں مسند بچھوائی تھی اور حضرت کے سامنے یحییٰ ابن اکثم کے لیئے بیٹھنے کی جگہ تھی ہر طرف کامل سناٹا تھا مجمع ہمہ تن

چشم و گوش بنا ہوا گفتگو شروع ہونے کے وقت کا منتظر ہی تھا کہ اس خاموشی کو یحییٰ کے اس سوال نے توڑ دیا جو اس نے مامون کی طرف مخاطب ہو کر کیا تھا "حضور کیا مجھے اجازت ہے کہ میں ابوجعفرؑ سے کوئی مسئلہ دریافت کروں"!

مامون نے کہا "تم کو خود ان ہی سے اجازت طلب کرنا چاہیئے۔

یحییٰ امام کی طرف متوجہ ہوا اور کہا "کیا آپ اجازت دیتے ہیں کہ میں آپ سے کچھ دریافت کروں؟

فرمایا "تم جو پوچھنا چاہو پوچھ سکتے ہو"!

یحییٰ نے پوچھا کہ "حالت احرام میں اگر کوئی شخص شکار کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟۔ اس سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ حضرت امام محمد تقیؑ کی علمی بلندی سے بالکل واقف نہ تھا وہ اپنے غرور علم اور جہالت سے یہ سمجھتا تھا کہ یہ کم سن صاحبزادے تو ابھی ہی روزمرہ کے روزے نماز کے مسائل سے واقف ہوں تو ہوں مگر حج وغیرہ کے احکام اور حالت احرام میں جن چیزوں کی ممانعت ہے ان کے کفاروں سے بھلا کہاں واقف ہوں گے۔

امامؑ نے اس کے جواب میں اس طرح سوال کے گوشوں کی الگ الگ تحلیل فرمائی جس سے بغیر کوئی جواب اصل مسئلے کا دیئے ہوئے آپ کے علم کی گہرائیوں کا یحییٰ اور تمام اہل محفل کو اندازہ ہو گیا یحییٰ خود بھی اپنے کو سبک پانے لگا اور تمام مجمع بھی اس کا سبک ہونا محسوس کرنے لگا آپ نے جواب میں فرمایا کہ تمہارا سوال بالکل مبہم اور مجمل ہے یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ شکار حل میں تھا یا حرم میں شکار کرنے والا مسئلے سے واقف تھا یا ناواقف؟ اس نے عمداً اس جانور

کو مذاقاً یا دھوکے سے قتل ہو گیا، وہ شخص آزاد تھا یا غلام کمسن تھا یا بالغ پہلی مرتبہ ایسا کیا تھا یا اس کے پہلے بھی ایسا کر چکا تھا، شکار پرند کا تھا یا کوئی اور چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ اپنے فعل پر اصرار رکھتا ہے یا پشیمان ہے؟ رات کو یا پوشیدہ طریقہ پر اس نے شکار کیا یا دن دہاڑے اور علانیہ؟ احرام عمرہ کا تھا یا حج کا، جب تک یہ تمام تفصیلات نہ بتائے جائیں اس مسئلے کا کوئی ایک معین حکم نہیں بتایا جا سکتا۔

یحییٰ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہوتا بہر حال فقہی مسائل پر کچھ نہ کچھ اس کی نظر بھی تھی وہ ان کثیر التعداد شقوں کے پیدا کرنے ہی سے خوب سمجھ گیا کہ ان کا مقابلہ میرے لیے آسان نہیں ہے اس کے چہرے پر ایسی شکستگی کے آثار پیدا ہوئے جن کا تمام دیکھنے والوں نے اندازہ کر لیا۔ اب اس کی زبان خاموش تھی اور وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا مامون نے اس کی کیفیت کا صحیح اندازہ کر کے اس سے کچھ کہنا بیکار سمجھا اور حضرت سے عرض کیا کہ پھر آپ ہی ان تمام شقوں کے احکام بیان فرما دیجئے تاکہ ہم سب کو استفادہ کا موقع مل سکے امام نے تفصیل کے ساتھ تمام صورتوں کے جداگانہ جو احکام تھے بیان فرمائے۔ یحییٰ ہکا بکا امام کا منہ دیکھ رہا تھا اور بالکل خاموش تھا مامون کو بھی کد تھی کہ وہ اتمام حجت کو انتہائی درجے تک پہونچا دے۔ اس لیے اس نے امام سے عرض کیا کہ اگر مناسب معلوم ہو تو آپ بھی یحییٰ سے کوئی سوال فرمائیں۔ حضرت نے اخلاقاً یحییٰ سے دریافت فرمایا کہ "کیا میں بھی تم سے کچھ پوچھ سکتا ہوں"؟ یحییٰ اب اپنے متعلق کسی دھوکے میں مبتلا نہ تھا، اپنا اور امام کا درجہ اسے خوب معلوم ہو چکا تھا، اس لیے طرز گفتگو اس کا اب دوسرا ہی تھا۔ اس نے کہا کہ "حضور دریافت فرمائیں اگر مجھے معلوم ہوگا تو عرض کر دوں گا ورنہ خود حضور ہی سے معلوم

کروں گا۔ حضرت نے سوال کیا جس کے جواب میں یحییٰ نے کھلے لفظوں میں اپنی عاجزی کا اقرار کیا اور پھر امام نے خود اس سوال کو حل فرما دیا۔ مامون کو اپنی بات کے بالا رہنے کی خوشی تھی۔ اس نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ :-

"دیکھو میں نہ کہتا تھا کہ یہ وہ گھرانا ہے جو قدرت کی طرف سے علم کا مالک قرار دیا گیا ہے یہاں کے بچوں کا بھی کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مجمع میں جوش و خروش تھا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ بیشک جو آپ کی رائے ہے وہ بالکل ٹھیک ہے اور یقیناً ابو جعفر محمد ابن علیؑ کا کوئی مثل نہیں ہے۔ مامون نے اس کے بعد ذرا بھی تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور اسی جلسے میں امام محمد تقی علیہ السّلام کے ساتھ ام الفضل کا عقد کر دیا۔ نکاح کے قبل جو خطبہ ہمارے یہاں عموماً پڑھا جاتا ہے وہی ہے جو کہ امام محمد تقیؑ نے اس عقد کے موقع پر اپنی زبان مبارک پر جاری کیا تھا۔ یہی بطور یادگار نکاح کے موقع پر باقی رکھا گیا ہے۔ مامون نے اس شادی کی خوشی میں بڑی فیاضی سے کام لیا، لاکھوں روپیہ خیر و خیرات میں تقسیم کیا گیا اور تمام رعایا کو انعامات و عطایا کے ساتھ مالا مال کیا گیا۔

**مدینہ کی طرف واپسی**

شادی کے بعد تقریباً ایک سال تک امام محمد تقیؑ بغداد میں مقیم رہے اس کے بعد مامون نے بہت اہتمام کے ساتھ ام الفضل کو حضرت کے ساتھ رخصت کیا اور امام مدینہ میں واپس تشریف لائے۔

**اخلاق و اوصاف**

امام محمد تقیؑ اخلاق و اوصاف میں انسانیت کی اُس بلندی پر تھے جس کی تکمیل رسولؐ اور آل رسولؐ کا طرہ امتیاز تھی ہر ایک سے جھک کر ملنا۔ ضرورت مندوں کی حاجت روائی کرنا مساوات

اور سادگی کو ہر حال میں پیش نظر رکھنا، غرباکی پوشیدہ طور پر خبر لینا، دوستوں کے علاوہ دشمنوں تک سے اچھا سلوک کرتے رہنا، مہمانوں کی خاطرداری میں انہماک اور علمی اور مذہبی پیاسوں کے لیے فیض کے چشموں کا جاری رکھنا آپ کی سیرت زندگی کا نمایاں پہلو تھا۔ بالکل ویسا ہی جیسے اس سلسلۂ عصمت کے دوسرے افراد کا تھا جن کے حالات اس سے پہلے لکھے جاچکے ہیں۔

اہل دنیا جو آپ کے بلندی نفس کا پورا اندازہ نہ رکھتے تھے انھیں یہ تصور ضرور ہوتا تھا کہ ایک کمسن بچے کا عظیم الشان مسلمان سلطنت کے شہنشاہ کا داماد ہو جانا یقیناً اس کے چال ڈھال طور طریقے کو بدل دیگا اور اس کی زندگی دوسرے سانچے میں ڈھل جائے گی حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا مقصد ہو سکتا ہے جو مامون کی کوتاہ نگاہ کے سامنے بھی تھا۔ بنی امیہ یا بنی عباس کے بادشاہوں کو آل رسولؐ کی ذات سے اتنا اختلاف نہ تھا جتنا ان کے صفات سے۔ وہ ہمیشہ اس کے درپے رہتے تھے کہ بلندی اخلاق اور معراج انسانیت کا وہ مرکز جو مدینہ میں قائم ہے اور جو سلطنت کے مادی اقتدار کے مقابلے میں ایک مثالی روحانیت کا مرکز بنا ہوا ہے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے۔ اسی کے لیے گھبرا گھبرا کر وہ مختلف تدبیریں کرتے تھے امام حسینؑ سے بیعت طلب کرنا اسی کی ایک شکل تھی، اور پھر امام رضاؑ کو ولیعہد بنانا اسی کا دوسرا طریقہ۔ فقط ظاہری شکل وصورت میں ایک کا انداز معاندانہ اور دوسرے کا طریقہ ارادت مندی کے روپ میں تھا۔ مگر اصل حقیقت دونوں صورتوں کی ایک تھی جس طرح امام حسینؑ نے بیعت نہ کی تو وہ شہید کر ڈالے گئے اسی طرح امام رضاؑ ولی عہد ہونے کے باوجود حکومت کے مادی مقاصد

کے ساتھ ساتھ نہ چل سکے تو آپ کو زہر کے ذریعے سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

اب مامون کے نقطۂ نظر سے یہ موقع انتہائی قیمتی تھا کہ امام رضاؑ کا جانشین تقریباً آٹھ برس کا بچہ ہے جو تین برس پہلے ہی باپ سے چھڑا لیا جا چکا تھا حکومت وقت کی سیاسی سوجھ بوجھ کہہ رہی تھی کہ اس بچے کو اپنے طریقے پر لانا نہایت آسان ہے اور اس کے بعد وہ مرکز جو حکومت وقت کے خلاف ساکن اور خاموش مگر انتہائی خطرناک قائم ہے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔

مامون امام رضاؑ کے ولی عہدی کی مہم میں اپنی ناکامی کو مایوسی کا سبب نہیں تصور کرتا تھا۔ اس لیے کہ امام رضاؑ کی زندگی ایک اصول پر قائم رہ چکی تھی۔ اس میں تبدیلی اگر نہیں ہوئی تو یہ ضروری نہیں کہ امام محمد تقیؑ جو آٹھ برس کے سن سے قصر حکومت میں نشو و نما پا کر بڑھیں وہ بھی بالکل اپنے بزرگوں کے اصول زندگی پر برقرار رہیں۔

سوا اُن لوگوں کے جو ان مخصوص افراد کے خداداد کمالات کو جانتے تھے اس وقت کا ہر شخص یقیناً مامون ہی کا ہم خیال ہوگا۔ مگر دنیا کو حیرت ہوگئی جب یہ دیکھا کہ وہ آٹھ برس کا بچہ جسے شہنشاہ اسلام کا داماد بنایا گیا ہے اس عمر میں اپنے خاندانی رکھ رکھاؤ اور اصول کا اتنا پابند ہے کہ وہ شادی کے بعد محل شاہی میں قیام سے انکار کر دیتا ہے اور اس وقت بھی کہ جب بغداد میں قیام رہتا ہے تو ایک علیحدہ مکان بکرایہ لے کر اس میں قیام فرماتے ہیں اس سے بھی امام کی مستحکم قوت ارادی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے عموماً مالی اعتبار سے لڑکی والے کچھ بھی بڑا درجہ رکھتے ہوتے ہیں تو وہ یہ پسند کرتے ہیں کہ جہاں وہ رہیں وہیں داماد

بھی رہے، اس گھر میں نہ سہی تو کم از کم اسی شہر میں اس کا قیام رہے، مگر امام محمد تقیؑ نے شادی کے ایک سال بعد ہی مامون کو حجاز واپس جانے کی اجازت پر مجبور کر دیا۔ یقیناً یہ امر ایک چاہنے والے باپ اور مامون ایسے باقتدار کے لیے انتہائی ناگوار تھا مگر اسے لڑکی کی جدائی گوارا کرنا پڑی اور امام مع ام الفضل کے مدینہ تشریف لے گئے۔

مدینہ میں تشریف لانے کے بعد ڈیوڑھی کا وہی انداز رہا جو اس کے پہلے تھا نہ پہریدار نہ کوئی خاص روک ٹوک نہ تزک نہ احتشام نہ اوقات ملاقات نہ ملاقاتیوں کے ساتھ برتاؤ میں کوئی تفریق۔ زیادہ تر نشست مسجد نبوی میں رہتی تھی جہاں مسلمان حضرت کے وعظ و نصیحت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ راویان حدیث احادیث دریافت کرتے تھے، طلاب علم مسائل پوچھتے تھے، صاف ظاہر تھا کہ جعفر صادقؑ ہی کا جانشین ہے جو اسی مسند علم پر بیٹھا ہوا ہدایت کا کام انجام دے رہا ہے۔

امور خانہ داری اور ازدواجی زندگی میں آپ کے بزرگوں نے اپنی بیویوں کو جن حدود میں رکھا تھا ان ہی حدود میں آپ نے ام الفضل کو بھی رکھا۔ آپ نے اس کی مطلق پرواہ نہ کی کہ آپ کی بیوی ایک شہنشاہ وقت کی بیٹی ہیں چنانچہ ام الفضل کے ہوتے ہوئے آپ نے حضرت عمار یاسر کی نسل سے ایک محترم خاتون کے ساتھ عقد بھی فرمایا اور قدرت کو نسل امامت اسی خاتون سے باقی رکھنا منظور تھی۔ یہی امام علی نقیؑ کی ماں ہوئیں۔ ام الفضل نے اس کی شکایت اپنے باپ کے پاس لکھ کر بھیجی مامون کے دل کے لیے بھی یہ کچھ کم تکلیف دہ امر

نہ تھا مگر اُسے اب اپنے کیے کو نباہنا تھا، اس نے ام الفضل کو جواب لکھا کہ میں نے تمھارا عقد ابو جعفرؑ کے ساتھ اس لیے نہیں کیا ہے کہ ان پر کسی حلال خدا کو حرام کر دوں مجھ سے اب اس قسم شکایت نہ کرنا۔

یہ جواب دے کر حقیقت میں اُس نے اپنی خفت مٹائی ہے۔ ہمارے سامنے اس کی نظیریں موجود ہیں کہ اگر مذہبی حیثیت سے کوئی با احترام خاتون ہوئی ہے تو اُس کی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے نکاح نہیں کیا گیا جیسے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے جناب خدیجہ اور حضرت علی مرتضیٰؑ کے لیے جناب فاطمہ زہراؑ مگر شہنشاہ دنیا کی بیٹی کو یہ امتیاز دینا صرف اس لیے کہ وہ ایک بادشاہ کی بیٹی ہے اسلام کی اُس رُوح کے خلاف تھا جس کے آل محمدؐ محافظ تھے اس لیے امام محمد تقیؑ نے اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنا اپنا فریضہ سمجھا۔

**تبلیغ و ہدایت** آپ کی تقریر بہت دلکش اور پر تاثیر ہوتی تھی ایک مرتبہ زمانۂ حج میں مکۂ معظمہ میں مسلمانوں کے مجمع میں کھڑے ہو کر آپ نے احکام شرع کی تبلیغ فرمائی تو بڑے بڑے علماء دم بخود اور دنگ رہ گئے اور انھیں اقرار کرنا پڑا کہ ہم نے ایسی جامع تقریر کبھی نہیں سنی۔

امام رضاؑ کے زمانہ میں ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا جو امام موسیٰ کاظمؑ پر توقف کرتا تھا یعنی آپ کے بعد امام رضا علیہ السلام کی امامت کا قائل نہیں تھا اور اسی لیے واقفیہ کہلاتا تھا۔ امام محمد تقیؑ نے اپنے دور میں اس گروہ میں ایسی کامیاب تبلیغ فرمائی کہ سب اپنے عقیدے سے تائب ہو گئے اور آپ کے زمانہ ہی میں کوئی ایک شخص ایسا باقی نہ رہ گیا جو اس مسلک کا حامی ہو۔

بہت سے بزرگ مرتبہ علماء نے آپ سے علوم اہل بیتؑ کی تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ایسے مختصر حکیمانہ مقولوں کا بھی ایک ذخیرہ ہے جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امیرالمومنین علی ابن ابیطالبؑ کے کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام کے بعد امام محمد تقیؑ کے مقولوں کو ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ الٰہیات اور توحید کے متعلق آپ کے بعض بلند پایہ خطبے بھی موجود ہیں۔

## عراق کا آخری سفر

۲۱۸ھ میں مامون نے دنیا کو خیرباد کہا۔ اب مامون کا بھائی اور ام الفضل کا چچا مؤتمن جو امام رضاؑ کے بعد ولی عہد بنایا جاچکا تھا تخت سلطنت پر بیٹھا اور معتصم باللہ عباسی کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کے بیٹھتے ہی امام محمد تقیؑ سے متعلق ام الفضل کے اسی طرح کے شکایتی خطوط کی رفتار بڑھ گئی۔ جس طرح کے اس نے اپنے باپ مامون کو بھیجے تھے۔ مامون نے چونکہ تمام بنی عباس کی مخالفتوں کے بعد بھی اپنی لڑکی کا نکاح امام محمد تقی علیہ السلام کے ساتھ کر دیا تھا اس لیے اپنی بات کی پچ اور کیے کی لاج رکھنے کی خاطر اس نے ان شکایتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں کی، بلکہ مایوس کر دینے والے جواب سے بیٹی کی زبان بند کر دی تھی مگر معتصم کو جو امام رضاؑ کی ولی عہدی کا داغ اپنے سینہ پر اٹھائے ہوئے تھا اور امام محمد تقیؑ کو داماد بنائے جانے سے تمام بنی عباس کے نمایندے کی حیثیت سے پہلے ہی اختلاف کرنے والوں میں پیش پیش رہ چکا تھا اب ام الفضل کے شکایتی خطوں کو اہمیت دے کر اپنے اس اختلاف کو جو اس نکاح سے تھا حق بجانب ثابت کرنا تھا۔ پھر سب سے زیادہ امام محمد تقیؑ کی علمی مرجعیت آپ کے اخلاقی اثر کا شہرہ جو حجاز سے بڑھ کر عراق تک پہونچا ہوا تھا

وہ بنائے مخاصمت جو معتصم کے بزرگوں کو امام محمد تقیؑ کے بزرگوں سے رہ چکی تھی، اور پھر اس سیاست کی ناکامی اور منصوبے کی شکست کا محسوس ہو جانا جو اس عقد کا محرک ہوا تھا جس کی تشریح پہلے ہو چکی ہے۔ یہ تمام باتیں تھیں کہ معتصم مخالفت کے لیے آمادہ ہو گیا۔ اپنی سلطنت کے دوسرے ہی سال امام محمد تقیؑ کو مدینہ سے بغداد کی طرف بلوا بھیجا، حاکم مدینہ عبد الملک کو اس بارے میں تاکیدی خط لکھا مجبوراً امام محمد تقیؑ اپنے فرزند امام علی نقیؑ اور ان کی والدہ کو مدینہ میں چھوڑ کر بغداد کی طرف روانہ ہوئے۔

**وفات**

بغداد میں تشریف لانے کے بعد تقریباً ایک سال تک معتصم نے بظاہر آپ کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی مگر آپ کا یہاں کا قیام خود ہی ایک جبری حیثیت رکھتا تھا، جسے نظر بندی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد اسی خاموش حربے سے جو اکثر اس خاندان کے بزرگوں کے خلاف استعمال کیا جا چکا تھا آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ۲۹ ر ذی القعدہ ۲۲۰ھ میں زہر سے آپ کی شہادت ہوئی اور اپنے جد بزرگوار حضرت امام موسی کاظمؑ کے پاس دفن ہوئے۔ آپ ہی کی شرکت کا لحاظ کر کے عربی کے قاعدے سے اس شہر کا نام کاظمین (دو کاظم یعنی غصّہ کو ضبط کرنے والے) مشہور ہوا ہے اس میں حضرت موسیٰ کاظمؑ کے لقب کو صراحتہً سامنے رکھا گیا جبکہ موجودہ زمانے میں اسٹیشن کا نام جوادین (دو جواد المعنی فیاض) درج ہے جس میں صراحتہً حضرت امام محمد تقیؑ کے لقب کو ظاہر کیا جا رہا ہے چونکہ آپ کا لقب تقی بھی تھا اور جواد بھی۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جتنے سادات رضوی کہلاتے ہیں وہ دراصل رضوی سید تقوی ہیں یعنی حضرت امام محمد تقیؑ کی اولاد ہیں اگر حضرت امام رضاؑ کی اولاد امام محمد تقیؑ کے علاوہ کسی اور فرزند کے ذریعے سے بھی ہوتی تو البتہ ان کے لیے وہ اپنے کو رضوی کہتی اور امام محمد تقی کی اولاد اپنے کو تقوی کہتی، مگر چونکہ امام رضاؑ کی نسل صرف امام محمد تقیؑ سے چلی اور حضرت امام رضاؑ کی شخصی شہرت سلطنت عباسیہ کے ولی عہد ہونے کی وجہ سے جمہور مسلمین میں بہت ہو چکی تھی اس لیے تمام اولاد کا حضرت امام رضاؑ کی طرف منسوب کر کے تعارف کیا جانے لگا اور رضوی کے نام سے مشہور ہوئے۔

دسویں امام

# حضرت علی نقی علیہ السّلام

**نام و نسب** اسم مبارک علی، کنیت ابوالحسن اور لقب نقی ہے۔ چونکہ آپ سے پہلے حضرت علی مرتضیٰؑ اور امام رضاؑ کی کنیت ابوالحسن ہو چکی تھی اس لئے آپ کو "ابوالحسن ثالث" کہا جاتا ہے والدۂ معظمہ آپ کی سمانہ خاتون تھیں

**ولادت اور نشوونما** ۵ رجب ۲۱۴ھ مدینۂ منورہ میں ولادت ہوئی صرف چھ برس اپنے والد بزرگوار کے زیر سایہ زندگی بسر کی۔

اس کے بعد اس کمسنی ہی کے عالم میں آپ اپنے والد بزرگوار سے جدا ہو گئے۔ امام محمد تقیؑ کو عراق کا سفر درپیش ہوا اور وہیں ۲۹ ذیقعدہ ۲۲۰ھ میں حضرت کی شہادت ہو گئی۔ جس کے بعد امامت کی ذمہ داریاں امام علی نقیؑ کے کاندھے پر آ گئیں۔ اس صورت میں سوا قدرت کی آغوش تربیت کے اور کون گہوارہ تھا جسے آپ کے علمی اور عملی کمال کی بلندیوں کا مرکز سمجھا جا سکے۔

**انقلابات سلطنت** حضرت امام علی نقیؑ کا دور امامت معتصم عباسی کے زمانہ سلطنت سے شروع ہوا۔ ۲۲۷ھ میں معتصم کا انتقال ہوا اور واثق باللہ کی حکومت شروع ہوئی ۲۳۲ھ میں واثق دنیا سے رخصت ہوا اور مشہور ظالم و سفاک، دشمن اہلبیت متوکل تخت حکومت پر بیٹھا ۲۵ھ میں

متوکل ہلاک ہوا اور منتصر باللہ خلیفہ تسلیم کیا گیا جو صرف چھ مہینہ سلطنت کرنے کے بعد مر گیا۔ اور مستعین باللہ کی سلطنت قائم ہوئی ۲۵۲ھ میں مستعین کو حکومت سے دست بردار ہو کر جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑا اور معتز باللہ بادشاہ ہوا یہی امام علی نقیؑ کے زمانے کا آخری بادشاہ ہے۔

## آلام و مصائب

معتصم نے خواہ اپنی ملکی پریشانیوں کی وجہ سے جو اُسے رومیوں کی جنگ اور بغداد کے دار السلطنت میں عباسیوں کے فساد وغیرہ کی وجہ سے درپیش تھیں اور خواہ امام علی نقیؑ کی کمسنی کا خیال کرتے ہوئے بہر حال حضرتؑ سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ اور آپ سکون و اطمینان کے ساتھ مدینہ منورہ میں اپنے فرائض پورے کرنے میں مصروف رہے۔

معتصم کے بعد واثق نے بھی آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ مگر متوکل کا تخت سلطنت پر بیٹھنا تھا کہ امام علی نقیؑ پر تکالیف و مصائب کا سیلاب امنڈ آیا یہ واثق کا بھائی اور معتصم کا بیٹا تھا اور آل رسولؐ کی دشمنی میں اپنے تمام آباؤ اجداد سے بڑھا ہوا تھا۔

اس سولہ برس میں کہ جب سے امام علی نقیؑ منصب امامت پر فائز ہوئے تھے آپ کی شہرت تمام مملکت اسلامی میں پھیل چکی تھی اور تعلیمات اہلبیتؑ کے پروانے اس شمع ہدایت پر برابر ٹوٹ رہے تھے ابھی متوکل کی سلطنت کو چار برس ہوئے تھے کہ مدینے کے حاکم عبداللہ بن حاکم نے امامؑ سے مخالفت کا آغاز کیا۔ پہلے تو خود حضرت کو مختلف طرح کی تکلیفیں پہونچائیں پھر متوکل کو آپ کے متعلق اسی طرح کی باتیں لکھیں جیسی سابق سلاطین کے پاس آپ کے بزرگوں کی نسبت ان کے دشمنوں کی طرف سے

پہونچائی جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ حضرت اپنے گرد و پیش اسباب سلطنت جمع کر رہے ہیں آپ کے ماننے والے اتنی تعداد میں بڑھ گئے ہیں کہ آپ جب چاہیں حکومت کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہو سکتے ہیں۔

حضرت کو اس تحریر کی بر وقت اطلاع ہو گئی اور آپ نے اتمام حجت کے طور پر اسی کے ساتھ متوکل کے پاس اپنی جانب سے ایک خط تحریر فرما دیا جس میں حاکم مدینہ کی اپنے ساتھ ذاتی مخالفت کا تذکرہ اور اس کی غلط بیانیوں کا اظہار فرمایا تھا متوکل نے ازراہ سیاست امام علی نقیؑ کے خط کو وقعت دیتے ہوئے مدینہ کے اس حاکم کو معزول کر دیا۔ مگر ایک فوجی رسالے کو یحییٰ بن ہرثمہ کی قیادت میں بھیج کر حضرت سے بظاہر دوستانہ انداز میں باصرار یہ خواہش کی کہ آپ مدینہ سے دار السلطنت سامرا تشریف لا کر کچھ دن قیام فرمائیں اور پھر واپس مدینہ تشریف لے جائیں۔

امام علیہ السلام اس التجا کی حقیقت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے یہ نیاز مندانہ دعوت تشریف آوری حقیقت میں جلاوطنی کا حکم ہے مگر انکار کا کوئی حاصل نہ تھا جب کہ انکار کے بعد اسی طلبی کے انداز کا دوسری شکل اختیار کر لینا یقینی تھا اور اس کے بعد روانگی ناگزیر تھی۔ بیشک مدینہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہونا آپ کے قلب کے لئے ویسا ہی تکلیف دہ ایک صدمہ تھا جیسے اس کے پہلے حضرت امام حسینؑ، امام موسیٰ کاظمؑ، امام رضاؑ اور امام محمد تقی علیہ السلام آپ کے مقدس اور بلند مرتبہ اجداد برداشت کر چکے تھے وہ اب آپ کے لئے ایک میراث بن چکا تھا۔ پھر بھی دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ مدینہ سے روانگی کے وقت آپ کے تاثرات اتنے شدید تھے جس سے احباب و اصحاب میں ایک کہرام برپا تھا۔

متوکل کا عریضہ بارگاہ امامؑ میں بڑے اخلاص اور اشتیاق قدم بوسی کا مظہر تھا۔ فوجی دستہ جو بھیجا گیا تھا وہ بہ ظاہر سواری کے تزک و احتشام اور امام کی حفاظت کا ایک سامان تھا مگر جب حضرت سامرے میں پہونچ گئے اور متوکل کو اس کی اطلاع دی گئی تو پہلا ہی اس کا افسوسناک رویہ یہ تھا کہ بجائے امام کے استقبال یا کم از کم اپنے یہاں بُلا کر ملاقات کرنے کے اس نے حکم دیا کہ حضرت کو "خان الصعالیک" میں اُتارا جائے۔ اس لفظ کے معنی ہی ہیں "بھیک مانگنے والے گداؤں کی سرا" اس سے جگہ کی نوعیت کا پورے طور پر اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ شہر سے دور ویرانے میں ایک کھنڈر تھا جہاں امام کو فروکش ہونے پر مجبور کیا گیا۔ اگرچہ یہ مقدس حضرات خود فقراء کے ساتھ ہم نشینی کو اپنے لئے ننگ و عار نہیں سمجھتے تھے اور تکلفات ظاہری سے کنارہ کش رہتے تھے مگر متوکل کی نیت تو احترام کے بہرحال تحقیر کے سوا اور کوئی نہیں تھی۔ تین دن تک حضرت کا قیام یہاں رہا اس کے بعد متوکل نے آپ کو اپنے حاجب زراقی کی حراست میں نظر بند کر دیا اور عوام کے لئے آپ سے ملنے جلنے کو ممنوع قرار دیا۔

وہی بے گناہی اور حقانیت کی کشش جو امام موسیٰ کاظمؑ کی قید کے زمانہ میں سخت سے سخت محافظین کو کچھ دن کے بعد آپ کی رعایت پر مجبور کر دیتی تھی اُسی کا اثر تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد زراقی کے دل پر امام علی نقیؑ کی عظمت کا سکہ قائم ہو گیا اور وہ آپ کو تکلیف دینے کے بجائے آرام و راحت کے سامان بہم پہونچانے لگا۔ مگر یہ بات زیادہ عرصہ تک متوکل سے چھپ نہیں سکتی تھی۔ اُسے علم ہو گیا اور اُس نے زراقی کی قید سے نکالکر حضرت کو ایک دوسرے شخص

سعید کی حراست میں دے دیا۔ یہ شخص بے رحم اور امام کے ساتھ سختی برتنے والا تھا اسی لیے اس کے تبادلے کی ضرورت نہیں پڑی اور حضرت پورے بارہ برس اس کی نگرانی میں مقید رہے۔ ان تکالیف کے ساتھ جو اس قید میں تھے حضرت شب و روز عبادت الٰہی میں بسر کرتے تھے۔ دن بھر روزہ رکھنا اور رات بھر نمازیں پڑھنا معمول تھا۔ آپ کا جسم کتنے ہی قید و بند میں رکھا گیا ہو مگر آپ کا ذکر چار دیواری میں محصور نہیں کیا جا سکتا تھا نتیجہ یہ تھا کہ آپ تو تنگ و تاریک کوٹھری میں مقید تھے مگر آپ کا چرچا سامرے بلکہ شاید عراق کے ہر گھر میں تھا اور اس بلند سیرت و کردار کے انسان کو قید رکھنے پر خلق خدا میں متوکل کے مظالم سے نفرت برابر پھیلتی جا رہی تھی۔

اب وہ وقت آیا کہ فتح بن خاقان باوجود آل رسولؐ سے محبت رکھنے کے صرف اپنی قابلیت اپنے تدبر اور اپنی دماغی و عملی صلاحیتوں کی بنا پر متوکل کا وزیر ہو گیا تو اس کے کہنے سننے سے متوکل نے امام علی نقیؑ کی قید کو نظر بندی سے تبدیل کر دیا اور آپ کو ایک زمین دے کر مکان تعمیر کرنے اور اپنے ذاتی مکان میں سکونت کی اجازت دے دی۔ مگر اس شرط سے کہ آپ سامرے سے باہر نہ جائینگے اور سعید آپ کے نقل و حرکت اور مراسلات و تعلقات کی نگرانی کرتا رہے گا۔

اس دور میں بھی امام کا استغنائے نفس دیکھنے کے قابل تھا باوجود دارالسلطنت میں مستقل طور پر قیام کے، نہ کبھی متوکل کے سامنے کوئی درخواست پیش کی، نہ کبھی کسی قسم کے ترحم یا تکرم کی خواہش ظاہر کی وہی عبادت و ریاضت کی زندگی جو قید کے عالم میں تھی اس نظر بندی کے دور میں بھی رہی جو کچھ تبدیلی ہوئی تھی وہ ظالم کے رویے میں تھی مظلوم کی شان جیسے پہلے تھی ویسی ہی اب بھی قائم

رہی اس زمانے میں بھی ایسا نہیں ہوا کہ امام کو بالکل آرام و سکون کی زندگی بسر کرنے دی جاتی۔ مختلف طرح کے تکالیف سے آپ کو دوچار ہونا پڑتا تھا۔ کہ جو جسمانی سے زیادہ روحانی ہوتے تھے۔ مثلاً یہ کہ آپ کے مکان کی تلاشی لی گئی کہ وہاں اسلحہ ہیں یا ایسے خطوط ہیں جن سے حکومت کی مخالفت کا ثبوت ملتا ہے۔ حالانکہ ایسی کوئی چیز ملی نہیں۔ مگر یہ تلاشی ہی ایک بلند اور بے گناہ انسان کے لئے کتنی باعث تکلیف چیز ہے اس سے بڑھ کر یہ واقعہ کہ دربار شاہی میں عین اُس وقت آپ کی طلبی ہوتی ہے جب کہ شراب کے دور چل رہے ہیں، متوکل اور تمام حاضرین دربار طرب و نشاط میں غرق ہیں اس پر طرہ یہ کہ سرکش، بے غیرت اور جاہل بادشاہ حضرت کے سامنے جام شراب بڑھا کر پینے کی درخواست کرتا ہے۔

شریعت اسلام کے محافظ معصوم کو اس سے جو تکلیف پہونچ سکتی ہے وہ تیر د خنجر سے یقیناً زیادہ ہے مگر حضرت نے نہایت متانت اور صبر و سکون کے ساتھ فرمایا کہ "مجھے اس سے معاف کیجئے، میرا اور میرے آباؤ اجداد کا خون اور گوشت اس سے کبھی مخلوط نہیں ہوا ہے۔"

اگر متوکل کے احساسات میں کچھ بھی زندگی باقی ہوتی تو وہ اس معصومانہ مگر پرُشکوہ جواب کا اثر قبول کرتا، مگر اُس نے کہا کہ اچھا یہ نہیں تو کچھ گانا ہی ہم کو سُنائیے۔

حضرت نے فرمایا "میں اس فن سے بھی واقف نہیں ہوں"

آخر اُس نے کہا کہ آپ کو کچھ اشعار جس طریقے سے بھی آپ چاہیں بہرحال پڑھنا ضرور پڑیں گے۔

کوئی جذبات کی رو میں بہنے والا انسان ہوتا تو اس خفیف الحرکات بادشاہ کے اس حقارت انگیز یا تمسخر آمیز برتاؤ سے متاثر ہو کر شاید اپنے توازن دماغی کو کھو دیتا مگر وہ کوہ حلم و وقار، امام کی ہستی تھی جو اپنے کردار کو فرائض کی منظالفت سے تکمیل تک پہونچانے کی ذمہ دار تھی۔ منہیات کے دائرہ سے نکل کر جب فرمائش اشعار سنانے تک پہونچی تو امام نے موعظہ و تبلیغ کے لئے اس موقع کو غنیمت سمجھ کر اپنے دل سے نکلی ہوئی پُر صداقت آواز سے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے جنھوں نے محفل طرب میں مجلس وعظ کی شکل پیدا کر دی۔

باتو اعلیٰ قلل الاجیال تحرسھم غلب الرجال فما اغنتھم القلل

رہے پہاڑوں کی چوٹی پر پہرے بٹھلا کر بہادروں کی حراست میں بچ سکے نہ مگر

واستنزلوا بعد عزمن معاقلھم الی مقابرھم یا بئس ما نزلوا

بلند قلعوں کی عزت جو پست ہوکے رہی تو کنج قبر میں منزل بھی کیا بری پائی

ناداھم صارخ من بعد ما دفنوا این الاسرۃ والتیجان والحلل

صدا یہ ان کو دی ہاتف نے بعد دفن لحد کہاں ہیں تخت، وہ تاج اور وہ لباس جسد

این الوجوہ التی کانت مجبۃ من دونھا تضرب الاستار والکلل

کہاں وہ چہرے ہیں جو تھے ہمیشہ زیر نقاب غبار جن پہ کبھی آنے دیتے تھے نہ حجاب

فافصح القبر عنھم حین سائلھم تلک الوجوہ علیھا الدود تنتقل

زبان حال سے بولے جواب میں مدفن وہ رخ زمین کے کیڑوں کا بن گئے مسکن

قد طال ما اکلوا فیھا وھم شربوا فاصبحوا الیوم طول الاکل قد اکلوا

غذائیں کھائیں، شرابیں جو پی تھیں حد سے سوا نتیجہ اس کا ہے خود آج بن گئے وہ غذا

اشعار کچھ ایسے حقیقی تاثرات کے ساتھ امامؑ کی زبان سے ادا ہوئے تھے کہ متوکل کے عیش و نشاط کی بساط اُلٹ گئی شراب کے پیالے ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور تمام مجمع زار و قطار رونے لگا۔ یہاں تک کہ خود متوکل ڈاڑھیں مار مار کر بے اختیار رو رہا تھا۔ جوں ہی ذرا رونا موقوف ہوا اُس نے امام کو رخصت کر دیا اور آپ اپنے مکان پر تشریف لے گئے۔

ایک اور نہایت شدید روحانی تکلیف جو امام کو اس دور میں پہونچی وہ متوکل کے تشدد وانہ احکام تھے جو نجف اور کربلا کے زائرین کے خلاف اس نے جاری کئے تھے۔ اس نے یہ حکم عام تمام قلمرو حکومت میں جاری کر دیا کہ کوئی شخص جناب امیرؑ اور امام حسینؑ کے روضوں کی زیارت کو نہ جائے جو بھی اس حکم کی مخالفت کرے گا اس کا خون حلال سمجھا جائے گا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اُس نے حکم دیا کہ نجف اور کربلا کی عمارتیں بالکل گرا کر زمین کے برابر کر دی جائیں، تمام مقبرے کھود ڈالے جائیں اور قبر امام حسینؑ کے گرد و پیش کی تمام زمین پر کھیت بو دیئے جائیں۔ یہ ناممکن تھا کہ زیارت کے امتناعی احکام پر اہلبیت رسولؐ کے جاں نثار آسانی کے ساتھ عمل کرنے کے لئے تیار ہو جاتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس سلسلے میں ہزاروں بیگناہوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی نظر آئیں۔ کیا اس میں کوئی شک ہے کہ ان میں سے ہر ایک مقتول کا صدمہ امام کے دل پر اتنا ہی ہوتا تھا جتنا کسی اپنے ایک عزیز کے بے گناہ قتل کیے جانے کا حضرت کو ہو سکتا تھا۔

پھر آپ ظلم و تشدد کے ایک ایسے ماحول میں گھیر رکھے گئے تھے کہ آپ دقت

کی مناسبت کے لحاظ سے ان لوگوں تک کچھ مخصوص ہدایات بھی نہیں پہونچا سکتے تھے جو ان کے لیے صحیح فرائض شرعیہ کے ذیل میں اس وقت ضروری ہوں۔

یہ اندوہناک صورت حال ایک دو برس نہیں بلکہ متوکل کی زندگی کے آخری وقت تک برابر قائم رہی۔

اور سنیے کہ متوکل کے دربار میں حضرت امیرالمومنین علی ابن طالبؑ کی نقلیں کی جاتی تھیں اور ان پر خود متوکل اور تمام اہل دربار ٹھٹھے لگاتے تھے۔ یہ ایسا اہانت آمیز منظر ہوتا تھا کہ ایک مرتبہ خود متوکل کے بیٹے سے رہا نہ گیا، اس نے متوکل سے کہا کہ خیر آپ اپنی زبان سے حضرت علیؑ کے بارے میں کچھ الفاظ استعمال کریں تو کریں مگر جب آپ اپنے کو ان کا عزیز قرار دیتے ہیں تو ان کم بختوں کی زبان سے حضرت علیؑ کے خلاف ایسی باتوں کو کیوں گوارا کرتے ہیں۔ اس پر بجائے کچھ اثر لینے کے متوکل نے اپنے بیٹے کا فحش آمیز تمسخر کیا اور دو شعر نظم کر کے گانے والوں کو دیئے۔ جس میں خود اُس کے فرزند کے لئے ماں کی گالی موجود تھی۔ گویے ان شعروں کو گاتے تھے اور متوکل قہقہے لگاتا تھا۔

اسی دور کا ایک اور واقعہ بھی کچھ کم قابل افسوس نہیں ہے۔ ابن السکیت بغدادی علم نحو و لغت کے امام مانے جاتے تھے اور متوکل نے اپنے دو بیٹوں کی تعلیم کے لیے انھیں مقرر کیا تھا ایک دن متوکل نے ان سے پوچھا کہ تمھیں میرے ان دونوں بیٹوں سے زیادہ محبت ہے یا حسنؑ و حسینؑ سے۔ ابن السکیت زمانے کی مجبوریوں سے متوکل کے نوکر ضرور تھے مگر دل میں محبت اہلبیت کی روشنی

رکھتے تھے۔ اس سوال کو سُن کر بیتاب ہو گئے اور انھوں نے متوکل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بے ڈھڑک کہدیا کہ حسنؑ و حسینؑ کا کیا ذکر مجھے تو علیؑ کے غلام قنبرؑ کے ساتھ ان دونوں سے کہیں زیادہ محبت ہے بس، اس جواب کا سُننا تھا کہ متوکل غصے سے بیخود ہو گیا حکم دیا کہ ابن السکیت کی زبان گدی سے کھینچ لی جائے یہی ہوا۔ اور اس طرح یہ آل رسولؐ کے فدائی درجۂ شہادت پر فائز ہوئے۔

ان واقعات کا براہ راست جسمانی طور پر حضرت امام علی نقیؑ سے تو کوئی تعلق نہ تھا مگر بحدا ان میں کی ہر ہر بات ایک تلوار کی دھار۔ تھی جو گلے پر نہیں دل پر چلا کرتی تھی۔ متوکل کا ظالمانہ رویہ ایسا تھا جس سے کوئی بھی دور یا نزدیک کا شخص اس سے خوش یا مطمئن نہیں تھا حد یہ ہے کہ اس کی اولاد تک اسکی جانی دشمن ہو گئی تھی چنانچہ اسی کے بیٹے منتصر نے اس کے بڑے مخصوص غلام باغر رومی کو ملا کر خود متوکل ہی کی تلوار سے عین اُس کی خواب گاہ میں اس کو قتل کرا دیا جس کے بعد خلائق کو اس ظالم انسان سے نجات ملی اور منتصر کی خلافت کا اعلان ہو گیا۔

منتصر نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی اپنے باپ کے متشددانہ احکام کو یکلخت منسوخ کر دیا نجف اور کربلا کی زیارت کے لئے عام اجازت دیدی اور ان مقدس روضوں کی کسی حد تک تعمیر کرا دی، امام علی نقیؑ کے ساتھ بھی اُس نے کسی خاص تشدد کا مظاہرہ نہیں کیا مگر منتصر کی عمر طولانی نہیں ہوئی وہ چھ مہینے کے بعد دُنیا سے اُٹھ گیا۔ منتصر کے بعد مستعین کی طرف سے امام کے خلاف کسی خاص بدسلوکی

کا برتاؤ نظر نہیں آتا۔

امام علیہ السّلام نے چونکہ مکان بنا کر مستقل قیام اختیار فرما لیا تھا اس لیے یا تو خود آپ ہی نے مناسب نہ سمجھا یا پھر ان بادشاہوں کی طرف سے آپ کے مدینہ واپس جانے کو پسند نہ کیا گیا ہو۔ بہر حال جو بھی وجہ ہو قیام آپ کا سامرہ ہی میں رہا۔ اتنے عرصہ تک حکومت کی طرف سے مزاحمت نہ ہونے کی وجہ سے علوم اہلبیت کے طلب گار ذرا اطمینان کے ساتھ کثیر تعداد میں آپ سے استفادہ کے لئے جمع ہونے لگے جس کی وجہ سے معتین کے بعد معتز کو پھر آپ سے پرخاش پیدا ہوئی اور اس نے آپ کی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیا۔

## اخلاق واوصاف

حضرت کی سیرت زندگی اور اخلاق وکمالات وہی تھے جو اس سلسلہ عصمت کی ہر فرد کے اپنے اپنے دور میں امتیازی طور پر مشاہدہ میں آتے رہے تھے۔ قید خانے اور نظر بندی کا عالم ہو یا آزادی کا زمانہ، ہر وقت اور ہر حال میں یاد الٰہی، عبادت، خلق خدا سے استغنا، ثبات قدم، صبر واستقلال مصائب کے ہجوم میں ماتھے پر شکن نہ ہونا، دشمنوں کے ساتھ بھی حلم ومروت سے کام لینا، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی امداد کرنا یہی اوصاف ہیں جو امام علی نقیؑ کی سیرت زندگی میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔

قید کے زمانہ میں جہاں بھی آپ رہے آپ کے مصلے کے سامنے ایک قبر کھدی ہوئی تیار رہتی تھی دیکھنے والوں نے جب اس پر حیرت ودہشت کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا میں اپنے دل میں موت کا خیال قائم رکھنے کے لیے یہ قبر اپنی نگاہوں کے

سامنے تیار رکھتا ہوں حقیقت میں یہ ظالم طاقت کو اس کے باطل مطالبۂ اطاعت اور اسلام کے حقیقی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے ترک کر دینے کی خواہش کا ایک خاموش اور عملی جواب تھا یعنی زیادہ سے زیادہ سلاطین وقت کے ہاتھ میں جو کچھ ہے وہ جان کا لے لینا مگر جو شخص موت کے لیے اتنا تیار ہو کہ ہر وقت کھدی ہوئی قبر اپنے سامنے رکھے وہ ظالم حکومت سے ڈر کر سر تسلیم خم کرنے پر کیوں کر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ دنیاوی سازشوں میں شرکت یا حکومت وقت کے خلاف کسی بے محل اقدام کی تیاری سے آپ کا دامن اس طرح بری رہا کہ باوجود دار السلطنت کے اندر مستقل قیام اور حکومت کے سخت ترین جاسوسی نظام کے کبھی آپ کے خلاف کوئی الزام صحیح نہیں ثابت ہو سکا اور کبھی سلاطین وقت کو کوئی دلیل آپ کے خلاف تشدد کے جواز کی نہ مل سکی باوجودیکہ سلطنت عباسیہ کی بنیادیں اس وقت اتنی کھوکھلی ہو رہی تھیں کہ دار السلطنت میں ہر روز ایک نئی سازش کا فتنہ کھڑا ہوتا تھا۔

متوکل سے خود اس کے بیٹے منتصر کی مخالفت اور اس کے انتہائی عزیز غلام باغر رومی کی اس سے دشمنی۔ منتصر کے بعد امرائے حکومت کا انتشار اور آخر متوکل کے بیٹوں کو خلافت سے محروم کرنے کا فیصلہ مستعین کے دور حکومت میں یحییٰ بن عمر بن یحییٰ حسین بن زید علوی کا کوفہ میں خروج۔ اور حسن بن زید الملقب بداعی الحق کا علاقہ طبرستان پر قبضہ کر لینا اور مستقل سلطنت قائم کر لینا پھر دار السلطنت میں ترکی غلاموں کی بغاوت

مستعین کا سامرے کو چھوڑ کر بغداد کی طرف بھاگنا اور قلعہ بند ہو جانا۔ آخر کو حکومت سے دست برداری پر مجبور ہونا اور کچھ عرصہ کے بعد معتز باللہ کے ہاتھ سے تلوار کے گھاٹ اُترنا۔ پھر معتز باللہ کے دور میں رومیوں کا مخالفت پر تیار رہنا معتز باللہ کو خود اپنے بھائیوں سے خطرہ محسوس ہونا اور موید کی زندگی کا خاتمہ اور موفق کا بصرہ میں قید کیا جانا۔

ان تمام ہنگامی حالات۔ ان تمام شورشوں ان تمام بے چینیوں اور جھگڑوں میں سے کسی میں بھی امام علی نقیؑ کی شرکت کا شبہ تک نہ پیدا ہونا کیا اس طرز عمل کے خلاف نہیں ہے جو ایسے موقعوں پر جذبات سے کام لینے والے انسانوں کا ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسے اقتدار کے مقابلے میں جسے نہ صرف وہ حق و انصاف کی رو سے ناجائز سمجھتے ہیں۔ بلکہ اُس کی بدولت اُنھیں جلا وطنی قید اور اہانتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا ہے مگر وہ جذبات سے بلند اور عظمت نفس کا کامل مظہر دنیاوی ہنگاموں اور وقت کے اتفاقی موقعوں سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانا اپنی بے لوث حقانیت اور کوہ سے بھی گراں صداقت کے خلاف سمجھتا ہے اور مخالف پر پس پشت سے حملہ کرنے کو اپنے بلند نقطۂ نگاہ اور معیار عمل کے خلاف جانتے ہوئے ہمیشہ کنارہ کش رہا کر

**وفات** معتز باللہ کے دور میں تیسری رجب ۲۵۴ھ کو سامرے میں آپ نے رحلت فرمائی۔ اُس وقت آپ کے پاس صرف آپ کے فرزند امام حسن عسکریؑ موجود تھے۔ آپ ہی نے اپنے والد بزرگوار کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کے فرائض انجام دیئے اور اسی مکان میں جس میں حضرت کا قیام تھا ایوان خاص میں آپ کو دفن کر دیا۔ وہیں اب آپ کا روضہ بنا ہوا ہے اور عقیدت مند زیارت سے شرف یاب ہوتے ہیں۔

# گیارھویں امام

# حضرت حسن عسکری علیہ السّلام

**نام و نسب** ابو محمد کنیت حسن نام اور سامرے کے محلہ عسکر میں قیام کی وجہ سے عسکری مشہور لقب ہے۔ والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ اور والدہ سلیل خاتون تھیں۔ جو عبادت، ریاضت، عفت، اور سخاوت کے صفات میں اپنے طبقے کے لئے مثال کی حیثیت رکھتی تھیں۔

**ولادت** ۱۰ ربیع الثانی ۲۳۲ھ مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی۔

**نشوونما اور تربیت** بچپن کے گیارہ سال تقریباً اپنے والد بزرگوار کے ساتھ وطن میں رہے جس کے لئے کہا جاسکتا ہے کہ یہ زمانہ اطمینان سے گذرا۔ اس کے بعد امام علی نقیؑ کو سفر عراق درپیش ہوگیا اور تمام متعلقین کے ساتھ ساتھ امام حسن عسکریؑ بھی اسی کم سنی کے عالم میں سفر کی زحمتوں کو اٹھاکر سامرے پہنچے۔ یہاں کبھی قید، کبھی نظر بندی اور کبھی کسی حد تک آزادی۔ مختلف دور سے گزرنا پڑا مگر ہر حال میں آپ اپنے بزرگ مرتبہ باپ کے ساتھ ہی ساتھ رہے۔ اس طرح باطنی اور ظاہری طور پر ہر حیثیت سے آپ کو اپنے والد بزرگوار کی تربیت و تعلیم سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کا موقع مل سکا۔

**زمانۂ امامت** سنہ ۲۵۴ھ میں آپ کی عمر بائیس ۲۲ برس کی تھی جب آپ کے والد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ کی وفات ہوئی حضرت نے اپنی وفات سے چار مہینہ قبل آپ کے متعلق اپنے وصی و جانشین ہونے کا اظہار فرما کر اپنے اصحاب کی گواہیاں لے لی تھیں۔ اب امامت کی ذمہ داریاں امام حسن عسکریؑ کے متعلق ہوئیں جنھیں آپ باوجود انتہائی شدید مشکلات اور سخت ترین ماحول کے ادا فرماتے رہے۔

**سلاطینِ وقت اور اُن کا رویہ** جیسا کہ اس کے پہلے ضمناً بیان ہوا امام حسن عسکریؑ کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ ان تمام تکالیف اور مصائب میں بھی شریک رہے جو آپ کے والد بزرگوار کو حراست اور نظربندی کے ذیل میں متعدد بار برداشت کرنا پڑے۔ اُس کے بعد جب آپ کا دور امامت شروع ہوا ہے تو سلطنت بنی عباس کے تخت پر معتز باللہ عباسی کا قیام تھا۔ معتز کی معزولی کے بعد مہتدی کی سلطنت ہوئی۔ گیارہ مہینے چند روز حکومت کرنے کے بعد اُس کا خاتمہ ہوا اور معتمد کی حکومت قائم ہوئی اُن میں سے کوئی ایک بادشاہ بھی ایسا نہ تھا جس کے زمانہ میں امام حسن عسکریؑ کو آرام وسکون ملتا باوجودیکہ اس وقت سلطنت بنی عباس بڑی سخت اُلجھنوں اور پیچیدگیوں میں گرفتار تھی۔ مگر ان تمام سیاسی مسائل اور مشکلات کے ساتھ ہر حکومت نے امام حسن عسکریؑ کو قید و بند میں رکھنا سب سے زیادہ ضروری سمجھا اس کا خاص سبب رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث تھی کہ میرے بعد بارہ جانشین ہوں گے اور اُن میں سے آخری مہدی آخر الزماں اور قائم

آل محمدؐ ہو گا۔ یہ حدیث برابر متواتر طریقے سے عالم اسلام میں گردش کرتی رہی تھی۔

خلفائے بنی عباس خوب جانتے تھے کہ سلسلۂ آل محمدؐ کے وہ افراد جو رسولؐ کی صحیح جانشینی کے مصداق ہو سکتے ہیں وہ یہی افراد ہیں جن میں سے گیارہویں ہستی امام حسن عسکریؑ کی ہے اس لئے ان ہی کا فرزند وہ ہو سکتا ہے جس کے بارے میں رسولؐ کی پیشین گوئی صحیح قرار پا سکے۔ لہذا کوشش یہ تھی کہ ان کی زندگی کا دنیا سے خاتمہ ہو جائے اس طرح کہ اُن کا کوئی جانشین دنیا میں موجود نہ ہو یہ سبب تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے لیے اُس نظر بندی پر اکتفا نہیں کی گئی جو امام علی نقیؑ کے لیے ضروری سمجھی گئی تھی بلکہ آپ کے لئے اپنے گھر بار سے الگ قید تنہائی کو ضروری سمجھا گیا یہ اور بات ہے کہ قدرتی انتظام کے ماتحت درمیان میں انقلابات سلطنت کے دقفے آپ کی قید مسلسل کے بیچ میں تھوڑی رہائی کے سامان پیدا کر دیا کرتے تھے مگر پھر بھی جو بادشاہ تخت سلطنت پر بیٹھتا تھا وہ اپنے پیش رو کے نظریے کے مطابق آپ کو دوبارہ مقید کرنے پر تیار ہو جاتا تھا۔ اس طرح آپ کی مختصر زندگی جو دور امامت کے بعد تھی اُس کا بیشتر حصہ قید و بند ہی میں گزرا۔

اس قید کی سختی معتمد کے زمانے میں بہت بڑھ گئی تھی۔ اگرچہ وہ مثل دیگر ظالم سلاطین کے آپ کے مرتبہ اور حقانیت سے خوب واقف تھا چنانچہ جب قحط کے موقع پر ایک عیسائی راہب کے دعوے کے ساتھ پانی برسانے کی وجہ سے مسلمانوں میں ارتداد کا فتنہ برپا ہوا اور لوگ عیسائیت کی طرف

دوڑنے لگے تو مسلمانوں کو گمراہی سے بچانے کے لیے وہ امام حسن عسکریؑ ہی تھے جو قید خانے سے باہر لائے گئے آپ نے مسلمانوں کے شکوک کو دور کر کے اُنھیں اسلام کے جادہ پر قائم رکھا اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ اب معتمد کو آپ کے پھر اُسی قید خانے میں واپس کرنے میں خجالت دامن گیر ہوئی اس لئے آپ کی قید کو آپ کے گھر میں نظر بندی کے ساتھ تبدیل کر دیا گیا مگر آزادی پھر بھی نصیب نہ ہوسکی۔

**سفراء کا تقرر** آئمہ اہلبیتؑ جس حال میں بھی ہوں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت سے امامت کے فرائض کو انجام دیتے رہتے تھے۔ امام حسن عسکریؑ پر اتنی شدید پابندیاں عائد تھیں کہ علوم اہلبیت کے طلبگاروں اور شریعت جعفری کے مسائل دریافت کرنے والوں کا آپ تک پہنچنا کسی صورت سے ممکن نہ تھا۔ اس لئے حضرت نے اپنے زمانہ میں یہ انتظام کیا کہ ایسے افراد جو امانت و دیانت نیز علمی و فقہی بصیرت کے اس درجہ حامل تھے کہ امام کے محل اعتماد ہوسکیں اُنھیں اپنی جانب سے آپ نے نائب مقرر کر دیا تھا۔ یہ حضرات جہاں تک کہ خود اپنے واقفیت کے حدود میں دیکھتے تھے اُس حد تک مسائل خود ہی بتا دیتے تھے اور وہ اہم مسائل جو اُن کی دسترس سے باہر ہوتے تھے اُنھیں اپنے پاس محفوظ رکھتے تھے اور کسی مناسب موقع پر امام کی خدمت میں رسائی حاصل کر کے اُن کو حل کرا لیتے تھے کیونکہ ایک شخص کا کبھی کبھی امام سے ملاقات کو آجانا حکومت کے لئے اتنا ناقابل برداشت نہیں ہوسکتا تھا جتنا کہ عوام کی جماعتوں کا مختلف اوقات میں حضرت تک پہنچنا۔

ان ہی سفراء کے ذریعہ سے ایک اور اہم خدمت بھی انجام پاتی تھی، وہ یہ کہ خمس جو حکومت الٰہیہ کے نمایندہ ہونے کی حیثیت سے اس نظام حکومت کو تسلیم کرنے والے ہمیشہ ائمہ معصومینؑ کی خدمت میں پہنچاتے رہے اور ان بزرگوں کی نگرانی میں وہ ہمیشہ دینی امور کے انصرام اور سادات کی تنظیم و پرورش میں صرف ہوتا رہا اب وہ رازدارانہ طریقہ پر ان ہی نائبوں کے پاس آتا تھا اور یہ امام علیہ السلام سے ہدایات حاصل کر کے انھیں ضروری مصارف میں صرف کرتے تھے یہ افراد اس حیثیت سے بڑے سخت امتحان کی منزل میں تھے کہ ان کو ہر وقت سلطنت وقت کے جاسوسوں کی سراغ رسانی کا اندیشہ رہتا تھا۔ اسی لئے عثمان بن سعید اور ان کے بیٹے ابو جعفر محمد بن عثمان نے جو امام حسن عسکریؑ کے ممتاز نائب تھے اور عین دارالسلطنت بغداد میں مقیم تھے، اپنے پاس متعلقہ افراد کی آمد و رفت کو حق بجانب قرار دینے کے لئے ایک بڑی دوکان روغنیات کی کھول لی تھی۔ اس طرح حکومت جور کے شدید شکنجہ ظلم کے اندر بھی حکومت الٰہیہ کا آئینی نظام چل رہا تھا۔ اور حکومت کا کچھ بس نہ چلتا تھا۔

## اخلاق و اوصاف

آپ اسی سلسلہ عصمت کی ایک کڑی تھے جس کا ہر حلقہ انسانی کمالات کے جواہر سے مرصع تھا۔

علم و حلم، عفو و کرم، سخاوت و ایثار سب ہی اوصاف بے مثال تھے عبادت کا یہ عالم تھا کہ اُس زمانے میں بھی کہ جب آپ سخت قید میں تھے معتمد نے جس سے آپ کے متعلق دریافت کیا یہی معلوم ہو کہ آپ دن بھر روزہ رکھتے ہیں اور رات بھر نمازیں پڑھتے ہیں اور سوا ذکر الٰہی کے کسی سے کوئی کلام نہیں فرماتے۔ اگرچہ آپ کو اپنے گھر پر آزادی کی سانسیں لینے کا موقع بہت ہی کم ملا پھر بھی جتنے عرصہ تک قیام رہا

دور دراز سے لوگ آپ کے فیض و عطا کے تذکرے سُن کر آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔ آپ کے اخلاق و اوصاف کی عظمت کا عوام و خواص سب ہی کے دلوں پر سکہ قائم تھا۔ چنانچہ جب احمد بن عبداللہ بن خاقان کے سامنے جو خلیفہ عباسی کی طرف سے شہر قم کے اوقاف و صدقات کے شعبہ کا افسر اعلیٰ تھا۔ سادات علوی کا تذکرہ آگیا تو وہ کہنے لگا کہ مجھے کوئی حسن عسکریؑ سے زیادہ بلند مرتبہ اور علم و ورع، زہد و عبادت، وقار و ہیبت، حیا و عفت، شرف و عزت اور قدر و منزلت میں ممتاز اور نمایاں نہیں معلوم ہوا۔ اُس وقت جب امام علی نقیؑ کا انتقال ہوا۔ اور لوگ تجہیز و تکفین میں مشغول تھے تو بعض گھر کے ملازمین نے اثاث البیت وغیرہ میں سے کچھ چیزیں غائب کر دیں اور انھیں خبر نہ تھی کہ امام کو اسکی اطلاع ہو جائے گی۔ جب تجہیز و تکفین وغیرہ سے فراغت ہوئی تو آپ نے ان نوکروں کو بلایا اور فرمایا کہ جو کچھ پوچھتا ہوں اگر تم مجھے سچ سچ بیان کر دو گے تو میں تمھیں معاف کر دوں گا اور سزا نہ دوں گا لیکن اگر غلط بیانی سے کام لیا تو پھر میں تمھارے پاس سے سب چیزیں برآمد بھی کرالوں گا اور سزا بھی دونگا اس کے بعد آپ نے ہر ایک سے اُن اشیاء کے متعلق جو اُس کے پاس تھیں دریافت کیا اور جب اُنھوں نے سچ بیان کر دیا تو اُن تمام چیزوں کو اُن سے واپس لے کر آپ نے اُن کو کسی قسم کی سزا نہ دی اور معاف فرما دیا۔

**علمی مرکزیت**

باوجودیکہ آپ کی عمر بہت مختصر ہوئی یعنی صرف اٹھائیس ۲۸ برس مگر اس محدود اور مشکلات سے بھری ہوئی زندگی میں بھی آپ کے علمی فیوض کے دریا نے بڑے بڑے بلند پایہ علماء کو سیراب ہونے کا موقع دیا۔ نیز اس زمانہ کے فلاسفہ کا جو دہریت اور الحاد کی تبلیغ کر رہے تھے مقابلہ فرمایا جمیں

نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ان میں ایک اسحٰق کندی کا واقعہ ہے کہ یہ شخص قرآن مجید کے آیات کے باہمی تناقض کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا تھا یہ خبر امام حسن عسکری کو پہونچی اور آپ موقع کے منتظر ہو گئے اتفاق سے ایک روز ابو اسحٰق کے کچھ شاگرد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں کوئی اتنا سمجھ دار آدمی نہیں ہے۔ جو اپنے استاد کندی کو اس فضول مشغلے سے روکے جو انھوں نے قرآن کے بارے میں شروع کر رکھا ہے، ان طلاب نے کہا حضور ہم تو اُن کے شاگرد ہیں ہم بھلا اُن پر کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔

حضرت نے فرمایا اتنا تو تم کر سکتے ہو جو کچھ باتیں میں تمھیں بتاؤں وہ تم اُن کے سامنے پیش کر دو۔ طلاب نے کہا جی ہاں اتنا ہم کر سکتے ہیں۔

حضرت نے کچھ آیتیں قرآن کی جن کے متعلق باہمی اختلاف کا توہم ہو رہا تھا پیش فرما کر اُن سے کہا کہ تم اپنے استاد سے اتنا پوچھو کہ کیا ان الفاظ کے بس یہی معنی ہیں جن کے لحاظ سے وہ تناقض ثابت کر رہے ہیں اور اگر کلام عرب کے شواہد سے دوسرے متعارف معنی نکل آئیں جن کے بنا پر الفاظ قرآن میں باہم کوئی اختلاف نہ رہے تو پھر انھیں کیا حق ہے کہ وہ اپنے ذہنی خود ساختہ معنی کو متکلم قرآنی کی طرف منسوب کر کے تناقض و اختلاف کی عمارت کھڑی کریں۔ اس ذیل میں آپ نے کچھ شواہد کلام عرب کے بھی اُن طلاب کے ذہن نشین کرائے۔ ذہین طلاب نے وہ پوری بحث اور شواہد کے حوالے محفوظ کر لیے اور اپنے اُستاد کے پاس جا کر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد یہ سوالات پیش کر دیے۔ آدمی بہر حال وہ منصف مزاج تھا اُس نے طلاب کی زبانی وہ سب کچھ سُنا اور کہا کہ یہ باتیں تمھاری قابلیت سے بالا تر ہیں۔ سچ سچ بتاؤ کہ یہ تمھیں

معلوم کہاں سے ہوئیں پہلے تو اُن طالب علموں نے چھپانا چاہا اور کہا کہ یہ چیزیں خود ہمارے ذہن میں آئی ہیں مگر جب اُس نے سختی کے ساتھ انکار کیا کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا تو انھوں نے بتا دیا کہ ہمیں ابو محمد حسن عسکری نے یہ باتیں بتائی ہیں یہ سُن کر اُس نے کہا کہ سوا اُس گھرانے کے اور کہیں سے یہ معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکتے تھے پھر اُس نے آگ منگوائی اور جو کچھ لکھا تھا وہ نذر آتش کر دیا۔

ایسے کتنے ہی علمی اور دینی خدمات تھے جو خاموشی کے ساتھ اپنا فرض سمجھ کر انجام پا رہے تھے اور حکومت وقت جو محافظت اسلام کی دعویدار تھی اپنے عیش و طرب کے نشے میں مدہوش تھی یا پھر چونکتی بھی تھی تو ایسے مخلص حامی اسلام کی طرف سے اپنی سلطنت کے لیے خطرہ محسوس کر کے ان پر کچھ پابندیاں بڑھا دیئے جانے کے احکام نافذ کرتی تھی مگر اس کوہ گران کے صبر و استقلال میں فرق نہ آتا تھا۔

جوامع حدیث میں محدثین اسلام نے آپ کی سند سے احادیث نقل کیے ہیں اُن میں سے ایک خاص حدیث شراب خواری کے متعلق ہے جس کے الفاظ یہ ہیں کہ "شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ" "شراب پینے والا مثل بُت پرست کے ہے"

اس کو ابن الجوزی نے اپنی کتاب "تحریم الخمر" میں سند متصل کے ساتھ درج کیا ہے اور ابو نعیم فضل بن دکیل نے کہا ہے کہ یہ حدیث صحیح ثابت ہے جس کی اہلبیت طاہرینؑ نے روایت کی ہے اور صحابہ میں سے ایک گروہ نے بھی اس کی رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کی ہے۔ جیسے ابن عباس، ابوہریرہ، انس، عبداللہ بن اوفی اسلمی اور دوسرے حضرات۔

سمعانی نے کتاب الانساب میں لکھا ہے کہ "ابو محمد احمد بن ابراہیم بن ہاشم علوی

بلاذری حافظ واعظ نے مکہ معظمہ میں امام اہلبیت ابو محمد حسن بن علی بن محمد بن علی بن موسیٰ الرضاؑ سے احادیث سن کر قلم بند کیے۔"

ان کے علاوہ حضرت کے تلامذہ میں سے چند باوقار ہستیوں کے نام درج ذیل ہیں۔ جن میں سے بعض نے حضرت کے علمی افادات کو جمع کر کے کچھ کتابیں بھی تصنیف کیں۔

(۱) ابو ہاشم داؤد بن قاسم جعفری سن رسیدہ عالم تھے انھوں نے امام رضاؑ سے امام حسن عسکری تک چار اماموں کی زیارت کی اور ان بزرگواروں سے فیوض بھی حاصل کیے، وہ امام علیہ السلام کی طرف سے نیابت کے درجہ پر فائز تھے۔ (۲) داؤد بن ابی زید نیشاپوری امام علی نقیؑ کے بعد امام حسن عسکریؑ کی صحبت سے شرفیاب ہوئے۔ (۳) ابو طاہر محمد بن علی بن بلال۔ (۴) ابو العباس عبداللہ بن جعفر حمیری قمی بڑے بلند پایہ عالم بہت سی کتابوں کے مصنف تھے جن میں سے قرب الاسناد کتاب اس وقت تک موجود ہے اور کافی وغیرہ کے ماخذوں میں سے ہے۔ (۵) محمد بن احمد بن جعفر قمی حضرت کے خاص نائبین میں سے تھے (۶) جعفر بن سہیل صیقل۔ یہ بھی نائب خاص ہونے کا شرف رکھتے تھے (۷) محمد بن حسن صفار قمی۔ بڑے مرتبہ کے عالم متعدد کتابوں کے مصنف ہیں جن میں سے بصائر الدرجات مشہور کتاب ہے انھوں نے امام حسن عسکریؑ کی خدمت میں تحریری مسائل بھیج کر ان کے جوابات حاصل کیے۔ (۸) ابو جعفر ہمانی برمکی۔ امام حسن عسکریؑ سے مسائل فقہیہ کے جوابات حاصل کر کے کتاب مرتب کی۔ (۹) ابراہیم بن ابی حفص ابو اسحٰق کاتب حضرت کے اصحاب میں سے ایک کتاب کے مصنف ہیں۔ (۱۰) ابراہیم بن مہزیار مصنف کتاب البشارات۔ (۱۱) احمد بن ابراہیم بن اسمٰعیل بن داؤد بن حمدان الکاتب الندیم

علم لغت وادب کے مسلم استاد تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے۔ حضرت امام حسن عسکری ؑ سے خاص خصوصیت رکھتے تھے۔ (۲۱) احمد بن اسحٰق الاشعری ابو علی القمی بڑے پایہ کے مستند و مسلّم عالم تھے۔ ان کی تصانیف میں سے علل العوم اور دیگر متعدد کتابیں تھیں۔

یہ چند نام بطور مثال درج کیے گیے۔ اگر تمام ان افراد کا تذکرہ کیا جائے تو اس کے لیے مستقل تصنیف کی ضرورت ہے خصوصیت کے ساتھ تفسیر قرآن میں ابو علی حسن بن خالد بن محمد بن علی برقی نے آپ کے افادات سے ایک ضخیم کتاب لکھی۔ جسے حقیقت میں خود حضرت ہی کی تصنیف سمجھنا چاہیے یعنی حضرت بولتے جاتے تھے اور وہ لکھتے جاتے تھے۔ علماء نے لکھا ہے کہ یہ کتاب ایک سو بیس ۱۲۰ اجزاء پر مشتمل تھی۔

افسوس ہے کہ یہ علمی ذخیرہ اس وقت ہاتھوں میں موجود نہیں ہے۔ مختلف کتابوں میں تفسیر قرآن کے متعلق حضرت کے بعض ارشادات ملتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی سے ماخوذ ہوں لیکن ایک کتاب جو "تفسیر امام حسن عسکری" کے نام سے شائع شدہ موجود ہے، مگر وہ مذکورۂ بالا ذخیرۂ علمی سے الگ ہے۔ اس کا پتہ صرف چوتھی صدی ہجری سے چلتا ہے اور شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی رحمۃ اللہ نے اُس کو معتبر سمجھا ہے مگر اُن کے پیش رو افراد جن سے موصوف نے اس تفسیر کو نقل کیا ہے بالکل مجہول الحال ہیں بہر حال اس تفسیر کے متعلق علمائے رجال مطمئن نہیں ہیں۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے اُس کی نسبت امام حسن عسکری ؑ کی طرف صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ ہاں بے شک آپ کا

ایک طویل مکتوب اسحٰق بن اسمٰعیل اشعری کے نام اور کافی ذخیرۂ مختصر حکیمانہ مقولات اور مواعظ و تعلیمات کا کتاب تحف العقول میں محفوظ ہے جو اس وقت بھی اہل نظر کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔

یہ علمی کارنامے اس حالت میں ہیں جب کہ مجموعی عمر آپ کی ۲۸ برس سے زیادہ نہ ہو سکی اور اپنے والد بزرگوار کے بعد صرف چھ برس امامت کے منصب پر فائز رہے اور وہ بھی اُن مشکلات کے شکنجہ میں جن کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

## وفات

اتنے علمی و دینی مشاغل میں مصروف انسان کو کہیں سلطنت وقت کے ساتھ مزاحمت کا کوئی خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اُن کا بڑھتا ہوا روحانی اقتدار اور علمی مرجعیت ہی تو ہمیشہ اُن حضرات کو سلاطین کے لیے ناقابل برداشت ثابت کرتی رہی۔ وہی اب بھی ہوا اور معتمد عباسی کے بھجوائے ہوئے زہر سے ۸ ربیع الاول ۲۶۰ھ میں آپ نے وفات پائی اور اپنے والد بزرگوار کی قبر کے پاس سامرے میں دفن ہوئے۔ جہاں حضرت کا روضہ باوجود ناموافق ماحول کے مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

# بارھویں امام
# صاحب العصر والزمان
# حضرت حجتؑ منتظر عجل اللہ فرجہ

## نام و نسب

جو اپنے خدا بزرگوار حضرت پیغمبر خدا کے بالکل ہم نام اور صورت و شکل میں ہو بہو اُن کی تصویر ہیں۔ والدہ گرامی آپ کی "نرجس" خاتون قیصر روم کی پوتی اور شمعون وصی حضرت عیسیٰ کی اولاد سے تھیں۔ امام حسن عسکریؑ کی ہدایت سے حضرت کی بزرگ مرتبت ہمشیر حلیمہ خاتون نے ان کو مسائل دینیہ اور احکام شرعیہ کی تعلیم دی تھی۔

## القاب و خطابات

غالباً ائمہ معصومینؑ میں حضرت علی بن ابی طالبؑ کے بعد سب سے زیادہ القاب ہمارے "امام عصرؑ" کے ہیں جن میں زیادہ مشہور ذیل کے خطابات ہیں۔

(۱) المہدی، یہ ایسا خطاب ہے جو نام کا قائم مقام بن گیا ہے اور پیشینگوئیاں جو آپ کے وجود کے متعلق پیغمبر اکرمؐ اور دیگر ائمہ معصومینؑ کی زبان پر آئی ہیں وہ زیادہ تر اس لفظ کے ساتھ ہیں اور اسی لیئے آنے والے "مہدی" کا اقرار تقریباً ضروریات اسلام میں داخل ہو گیا ہے جس میں اگر اختلاف ہو سکتا ہے تو اوصاف و حالات کی تعین میں لیکن اصل "مہدی" کے ظہور کا عقیدہ مسلمانوں میں ہر شخص کو رکھنا لازمی ہے۔ اُن حضرات کا ذکر نہیں جو اپنے کو مسلمان صرف سوسائٹی کے اثر یا سیاسی مصلحتوں سے

رکھتے ہیں مگر ان کے دل میں حاضر و ناظر معدلت پسند رب الارباب کا عقیدہ ہی موجود نہیں تو اُس کے رسولؐ کی کسی ایسی خبر غیبی کی تصدیق جو ابھی وقوع میں نہیں آئی ان کے حاشیہ خیال میں کہاں جگہ پا سکتی ہے۔

"مہدی" کے لفظ کے معنی "ہدایت پائے ہوئے" کے ہیں اسی لحاظ سے کہ "اصل ہادی" (راستہ بتانے والی) ذات خالق ہے جس کے لحاظ سے خود پیغمبرؐ سے خطاب کر کے قرآن کریم میں یہ آیت آئی ہے (انک لا تھدی من احببت ولکن اللہ یھدی من یشاء) تمہارے بس کی بات نہیں ہے کہ جس کو چاہو تم ہدایت کر دو بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے اور اسی اعتبار سے سورہ "الحمد" میں بارگاہ الٰہی میں دعا کی گئی ہے "اھدنا الصراط المستقیم ہم کو سیدھے راستہ پر لگا دے" اس فقرہ کو خود پیغمبرؐ اور آئمہ معصومین بھی اپنی زبان پر جاری کرتے تھے اس لئے خداوند عالم کی ہدایت کے لحاظ سے ان رہنمایان دین کو "مہدی" کہنا صحیح تھا۔ جو صفت کے لحاظ سے سب ہی بزرگوار تھے اور خطاب کے لحاظ سے حضرت "امام منتظر" کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔

(۲) "القائم" یہ لقب اُن احادیث سے ماخوذ ہے جس میں جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے "کہ دُنیا ختم نہیں ہو سکتی جب تک میری اولاد میں سے ایک شخص قائم (کھڑا) نہ ہو جو دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے۔

(۳) صاحب الزماں" اس اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے زمانے کے رہنمائے حقیقی ہیں۔

(۴) "حجت خدا" ہر نبی اور امام اپنے دور میں خالق کی حجت ہوتا ہے جس کے ذریعہ

سے ہدایت کی ذمہ داری جو اللہ پر ہے وہ پوری ہوتی ہے اور بندوں کے پاس اپنی کوتاہیوں کے جواز کی کوئی سند نہیں رہتی۔ چونکہ ہمارے زمانہ میں رہنمائی خلق کی ذمہ داری حضرت کے ذریعہ سے پوری ہوتی ہے اس لئے قیام قیامت تک حجت خدا آپ ہیں۔

(۵) "منتظر" چونکہ امام "مہدی" کے ظہور کی بشارتیں برابر رہنمایان دین دیتے رہے ہیں یہاں تک کہ صرف مسلمانوں میں نہیں بلکہ دوسرے مذاہب میں بھی چاہے نام کوئی دوسرا ہو مگر ایک آنے والے کا آخر زمانہ میں انتظار ہے۔ ولادت کے قبل سے پیدائش کا انتظار رہا اور اب غیبت کے بعد دنیا کو ظہور کا انتظار ہے۔ اس لیئے آپ خود حضرت، حکم الٰہی کے منتظر ہوتے ہوئے تمام خلق کے لئے منتظر یعنی مرکز انتظار ہیں۔

## پیشین گوئیاں

آپ کے دنیا میں آنے سے پہلے پیشین گوئی متواتر طریقے سے پیغمبر اسلامؐ اور آئمہ معصومینؑ کی زبانوں پر آتی رہی تھی جن میں سے ہر معصوم کی صرف ایک خبر اس موقع پر درج کی جاتی ہے۔

## حضرت خاتم النبیین محمد مصطفےٰ ؐ

حضرت کی زبان مبارک سے احادیث اس کثرت سے اس موضوع پر وارد ہوئے ہیں کہ صحاح و مسانید اُن سے مملو ہیں اور متعدد علمائے اہل سنت نے ان کو مستقل تصانیف میں جمع کیا ہے جیسے حافظ محمد بن یوسف گنجی شافعی نے "البیان فی اخبار صاحب الزماں" میں حافظ ابو نعیم اصفہانی نے ذکر "نعت المہدی" اس کے علاوہ ابو داؤد سجستانی نے اپنے سنن میں جس کا صحاح ستہ میں

میں شمار ہوتا ہے کتاب "المہدی" کا مستقل عنوان قائم کیا ہے اسی طرح ترمذی نے "صحیح" میں اور ابن ماجہ قزوینی نے اپنی کتاب "سنن" میں اور حاکم نے "مستدرک" میں بھی ان احادیث کو وارد کیا ہے۔

صرف ایک حدیث یہاں درج کی جاتی ہے جیسے محمد بن ابراہیم حموی شافعی نے اپنی کتاب "فرائد السمطین" میں درج کیا ہے وہ یہ ہے ابن عباس نے روایت کی کہ حضرت رسول خدا نے فرمایا۔ انا سید النبین وعلیؑ سید الوصیین وان اوصیائی بعدی اثنا عشر اولھم علیؑ وآخرھم المھدی میں انبیا کا سردار ہوں اور علیؑ اوصیاء کے سردار ہیں۔ میرے اوصیاء (قائم مقام) میرے بعد بارہ ہوں گے جن میں اول علیؑ ہیں اور آخری "مھدیؑ" ہوں گے۔

## حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا

کافی کلینی میں جابر بن عبد اللہ انصاری کی روایت ہے کہ حضرت فاطمہؑ زہرا کے پاس ایک لوح تھی جس میں تمام اوصیاء و آئمہ کے نام درج تھے۔ جناب سیدہ نے اس لوح سے بارہ اماموں کے ناموں کی خبر دی جن میں سے تین محمدؐ تھے اور چار علیؑ۔ ان کی آخری فرد آپ کی اولاد میں سے وہ ذات ہے جو قائم ہوگی۔

## (۳) حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالبؑ

جناب شیخ صدوق محمد بن علی بن بابویہ قمی نے "اکمال الدین" میں امام رضا کی حدیث آپ کے آبائے طاہرینؑ کے ذریعہ سے نقل کی ہے کہ جناب امیرؑ نے اپنے فرزند امام حسینؑ کو مخاطب کر کے فرمایا

"تیری نسل میں سے نواں وہ ہے جو حق کے ساتھ قائم دین کا ظاہر کرنے والا اور عدل و انصاف کا پھیلانے والا ہو گا۔"

**(۴) امام حسن مجتبیٰؑ** صدوق، اکمال الدین "میرے بھائی حسینؑ کی نسل سے نواں جب پیدا ہو گا تو خداوند عالم اس کی عمر کو غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا، پھر جب وقت آئے گا تو اُسے اپنی قدرت کاملہ سے ظاہر فرمائے گا۔

**(۵) سید الشہداء امام حسینؑ** نواں میری نسل میں سے وہ امام ہے جو حق کے ساتھ قایم ہو گا جس کے ذریعہ سے اللہ زمین کو موت کے بعد زندگی عطا کرے گا اور جس کے ذریعے دین حق کو تمام مذاہب پر غلبہ حاصل ہو گا۔ اس کی ایک طولانی غیبت ہو گی جس میں بہت سے گمراہ ہو جائیں گے اور کچھ ثابت قدم رہیں گے جنھیں ایذائیں برداشت کرنا پڑیں گی اور اُن سے لوگ کہیں گے کہ اگر سچے ہو تو بتاؤ یہ وعدہ پورا کب ہو گا جو اس غیبت کے زمانہ میں اس اذیت اور انکار پر صبر کریں گے انھیں رسولؐ کے ہمراہ رکاب جہاد کرنے کا ثواب حاصل ہو گا۔

**(۶) امام زین العابدینؑ** ہم میں سے قائم وہ ہو گا جس کی ولادت لوگوں سے پوشیدہ رہے گی، یہاں تک کہ عام لوگ کہیں گے وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

**(۷) امام محمد باقرؑ** کافی کلینی "حسینؑ کے بعد نو امام معین ہیں جن میں سے نواں امام قائم ہو گا۔"

**(۸) امام جعفر صادقؑ** علل الشرائع شیخ صدوق میں روایت ہے فرمایا حضرت نے کہ میرے موسیٰؑ فرزند کی نسل سے پانچواں قائم آل محمدؐ ہو گا۔"

## (۹) امام موسیٰ کاظمؑ

اکمال الدین صدوق. کسی نے امام موسیٰ کاظمؑ سے کہا کہ کیا آپ قائم بحق ہیں حضرت نے فرمایا حق کے ساتھ قائم و برقرار تو میں بھی ہوں مگر اصل میں قائم وہ ہوگا جو زمین کو دشمنان خدا سے پاک کر دیگا اور اُسے عدل و انصاف سے مملو کر دے گا۔ وہ میری اولاد میں سے پانچواں شخص ہوگا اس کی ایک طولانی غیبت ہوگی جس میں بہت سے مرتد ہو جائیں گے اور کچھ لوگ ثابت قدم رہیں گے۔"

## (۱۰) امام رضاؑ

دعبل نے آپ کے سامنے جب اپنا مشہور قصیدہ پڑھا اور اُس میں ان دو شعروں تک پہونچے۔

خروج الامام لا محالة قائم — یقوم علی اسم اللہ والبرکات

یمیّز فینا کل حق و باطل — ویجزی علی النعماء والنقمات

زمانہ میں ظہور قائم آل عبا ہوگا — مدد سے جو خدا کے نام و برکت کی کھڑا ہوگا

جہاں میں تیا حق و باطل آگے کر دیگا — وہ دیگا مومن و کافر کو ہر کردار کا بدلا

یہ سنتے ہی امام رضاؑ نے گریہ فرمایا اور پھر سر اُٹھا کر کہا اے دعبل، یہ شعر تمہاری زبان پر روح القدس نے جاری کرائے ہیں تمھیں معلوم بھی ہے کہ یہ امام کون ہے اور کب کھڑا ہوگا دعبل نے کہا یہ تفصیلات تو مجھے معلوم نہیں مگر میں سنتا رہا ہوں کہ آپ میں ایک امام ایسا ہوگا جو زمین کو فساد سے پاک اور عدل و انصاف سے مملو کر دے گا حضرت نے فرمایا اے دعبل میرے بعد امام میرا فرزند محمدؑ ہوگا اور اُس کے بعد اُس کا فرزند علیؑ اور علیؑ کے بعد اس کا بیٹا حسنؑ اور حسنؑ کے بعد اُسکا بیٹا قائمؑ، ہوگا جسکی غیبت کے دور میں اسکا انتظار رہے گا اور ظہور کے موقع پر دُنیا اُسکے سامنے سر تسلیم خم کریگی۔

**(۱۱) امام محمد تقیؑ** قائم ہم میں سے وہی مہدیؑ ہوگا جو میری نسل میں تیسرا ہوگا۔

**(۱۲) امام علی نقیؑ** میرا جانشین تو بعد میرے میرا فرزند حسنؑ ہے مگر اسکے جانشین کے دور میں تمہارا کیا عالم ہوگا سننے والوں نے پوچھا کہ کیوں؟ اس کا کیا مطلب؟ فرمایا اس لئے کہ تمھیں اسے دیکھنے کا موقع نہ ملے گا بعد اس کے نام تک لینے کی اجازت نہ ہوگی۔ عرض کیا گیا پھر اُن کا نام کسطرح لیا جائے گا فرمایا بس یوں کہنا کہ "الحجۃ من آل محمدؐ"۔

**(۱۳) امام حسن عسکریؑ** حضرت سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ کے آبائے طاہرینؑ نے یہ فرمایا ہے کہ زمین حجت خدا سے قیامت تک کبھی خالی نہیں ہو سکتی؟ اور جو مر جائے اور اپنے امام زمانہ کی اُسے معرفت حاصل نہ ہوئی ہو وہ جاہلیت کی موت دنیا سے گیا؟ آپ نے فرمایا کہ "بیشک یہ اسی طرح حق ہے جس طرح روز روشن حق ہوتا ہے" عرض کیا گیا کہ پھر حضور کے بعد حجت اور امام کون ہوگا فرمایا" میرا فرزند جو پیغمبر خداؐ کا ہم نام ہے میرے بعد امام و حجت ہوگا جو شخص بغیر اُس کی معرفت حاصل کیے ہوئے دُنیا سے اُٹھا وہ جاہلیت کی موت مرا۔ بیشک اُس کی غیبت کا دور اتنا طولانی ہوگا جس میں جاہل لوگ حیران اور سرگرداں پھریں گے اور باطل پرست ہلاکت ابدی میں گرفتار ہوں گے اور وقت مقرر کرکے پیشین گوئیاں کرنے والے غلط گو ہوں گے۔

**نتیجہ:۔** ان تمام احادیث سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اسلامؐ کے وقت سے برابر ہر دور میں اس ذات کی خبر دی جاتی رہی تھی جو "مہدی دین" ہوگا بلکہ وعیسٰی کی

روایت سے ظاہر ہے کہ یہ امر اتنا مشہور تھا کہ شعراء تک اسے نظم کرتے تھے اس کے ساتھ تواریخ پر نظر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دوست و دشمن سب ان حدیثوں سے واقف تھے یہاں تک کہ بسا اوقات اُن سے غلط فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ چنانچہ سلسلہ عباسیہ میں سے محمد نام جس کا تھا اس نے اپنا لقب مہدی اسی لئے اختیار کیا اور نسل امام حسنؑ سے عبداللہ محض کے فرزند محمد کے متعلق بھی مہدی ہونے کا عقیدہ قائم کیا گیا اور "کیسانیہ" نے محمد بن حنفیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا مگر ائمہ اہلبیتؑ میں سے ایک معصوم ہستی کا اسی وقت پر وجود خود ان خیالات کی رد کے لئے کافی تھا اور یہ حضرات ان غلط دعویداروں کے دعاوی کے غلط بتانے کے ساتھ اصل "مہدی" کے اوصاف اور اُسکی غیبت کا تذکرہ برابر کرتے رہے اس سے یہ حقیقت صاف ظاہر ہو گئی کہ اصل "مہدی" کی تشریف آوری کا انتظار متفقہ طور پر موجود تھا اُس کے ساتھ پیغمبرؐ کی وہ حدیثیں بھی متواتر صورت سے موجود تھیں کہ میری اولاد میں بارہ جانشین میرے ہوں گے اور یہ تعداد خود اُن غلط مدعیوں کے دعوے کے بطلان کے لیے کافی تھی لیکن اب جبکہ امام حسن عسکریؑ تک گیارہ کی تعداد ائمہ کی پوری ہو گئی تو دُنیا بے چینی کے ساتھ اسی امام کی طلبگار ہو گئی جو اپنی پیدائش کے قبل بھی "منتظر" تھا اور پیدائش کے بعد بھی غیبت کی بنا پر مصلحت الٰہی کے تقاضا تک منتظر رہنے والا تھا۔

**ولادت**

وہ وقت جس کا معصومینؑ کو انتظار تھا، آخر کو آ ہی گیا اور پندرہ ۱۵ شعبان ۲۵۵ھ کی رات کو سامرے میں اس مبارک و مقدس

بچے کی ولادت ہوئی۔ امام حسن عسکریؑ نے اس موقع پر کافی مقدار میں روٹیاں اور گوشت راہ خدا میں صدقہ کرایا اور عقیقہ میں کئی بکروں کی قربانی فرمائی۔

## نشوونما اور تربیت

آئمہ اہلبیتؑ میں یہ کوئی نئی بات نہیں کہ ان کو ظاہری حیثیت سے تعلیم و تربیت کا موقع حاصل نہ ہو سکا ہو اور وہ بچپن ہی میں قدرت کی طرف کے انتظام خاص کے ساتھ کمالات کے جوہر سے آراستہ کر کے امامت کے درجہ پر فائز کر دیئے گئے ہوں۔ اسکی نظریں حضرت امام منتظرؑ کے پہلے بھی کئی سامنے آ چکی تھیں جیسے آپ کے جد بزرگوار حضرت امام علی نقیؑ جن کی عمر اپنے والد امام محمد تقیؑ کی وفات کے وقت چھ برس اور چند مہینہ سے زیادہ نہ تھی اور اس کے پہلے امام محمد تقیؑ جن کی عمر اپنے والد امام رضاؑ کے انتقال کے وقت آٹھ برس سے زیادہ نہ تھی ظاہر ہے کہ یہ مدت عام افراد کے لحاظ سے بظاہر اسباب نشوونما اور تعلیم و تربیت کے لئے ناکافی ہے مگر جب خالق کی مخصوص عطا کو ان حضرات کے بارے میں تسلیم کر لیا تو اب سات اور چھ اور پانچ برس کے فرق کا بھی کوئی سوال باقی نہیں رہ سکتا اگر سات برس کے سن میں امامت کا منصب حاصل ہو سکتا ہے اور چھ برس کے سن میں حاصل ہو سکتا ہے جس کی نظیریں قبل کے اماموں کے یہاں دنیا کی آنکھوں کے سامنے آ چکیں تو پانچ یا چار برس میں بھی یہ منصب اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے اور اس میں کسی شک و شبہہ کی گنجائش نہیں ہے۔

بارھویں امامؑ کو اپنے والد کی آغوش شفقت و تربیت سے بہت کم عمر میں جدا ہونا پڑا یعنی شعبان ۲۵۵ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ربیع الاول

۲۶۰ھ میں آپ کے والد بزرگوار حضرت امام حسن عسکریؑ کی وفات ہوگئی اسکے معنی یہ ہیں کہ آپ کی عمر اس وقت صرف ساڑھے چار برس کی تھی اور اسی کمسنی میں آپ کے سر پر خالق کی طرف سے امامت کا تاج رکھ دیا گیا۔

## حکومت وقت کا تجسس

بالکل اُسی طرح جیسے فرعون مصر نے یہ پیشین گوئی سُن لی تھی کہ بنی اسرائیل میں پیدا ہونے والا ایک بچہ میرے ملک کی تباہی کا باعث ہوگا تو اُس نے اسکی کوششیں صرف کر دیں کہ وہ بچہ کسی طرح پیدا ہی نہ ہونے پائے اور پیدا ہو تو زندہ نہ رہنے پائے اسیطرح متواتر احادیث کی بنا پر عباسی سلطنت کے فرمانروا کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ حسن عسکریؑ کے یہاں اس مولود کی پیدائش ہوگی جس کے ذریعہ باطل حکومتیں تباہ ہو جائیں گی تو اُسکی طرف سے انتہائی شدت کے ساتھ انتظامات کیے گئے کہ ایک ایسے مولود کی پیدائش کا امکان باقی نہ رہے اسی لیے امام حسن عسکریؑ کو مسلسل قید و بند میں رکھا گیا مگر قدرت الٰہی کے سامنے کوئی بڑی سے بڑی مادی طاقت بھی کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی۔

جس طرح فرعون کی تمام کوششوں کے باوجود موسیٰؑ پیدا ہوئے اسی طرح سلطنت عباسیہ کے تمام انتظامات کے باوجود امام منتظرؑ کی ولادت ہوئی مگر یہ قدرت کی طرف کا انتظام تھا کہ آپ کی پیدائش کو صیغہ راز میں رکھا گیا اور جسے قدرت اپنا راز بنائے اُس کے افشار پر کون قادر ہو سکتا ہے بیشک ذرا دیر کے لئے خود اُس کی مصلحت اسکی متقاضی ہوئی کہ راز پر سے پردہ ہٹایا جائے جب امام حسن عسکریؑ کا جنازہ غسل و کفن کے بعد نماز جنازہ

کے لئے رکھا ہوا تھا شیعیان خاص کا مجمع تھا اور نماز کے لئے صفیں بندھ چکی تھیں امام حسن عسکریؑ کے بھائی جعفر نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھ چکے تھے اور تکبیر کہنا ہی چاہتے تھے کہ ایک دفعہ حرم سرائے امامت سے ایک کمسن بچہ برآمد ہوا اور بڑھتا ہوا صفوں کے آگے پہونچا اور جعفر کی عبا کو ہاتھ میں لے کر کہا "چچا پیچھے ہٹیئے اپنے باپ کی نماز جنازہ پڑھانے کا حق مجھے زیادہ ہے" جعفر بیساختہ پیچھے ہٹے اور صاحبزادہ نے آگے بڑھ کر نماز پڑھائی پھر صاحبزادہ حرم سرا میں واپس گیا غیر ممکن تھا کہ یہ خبر خلیفۂ وقت کو نہ پہونچتی چنانچہ پہونچی اور اب زیادہ شدت و قوت کیساتھ تلاش شروع ہو گئی کہ ان صاحبزادہ کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے یا ان کی زندگی کا خاتمہ کیا جائے۔

## غیبت

حضرت امام منتظرؑ کی امامت کا زمانہ اب تک دو غیبتوں میں تقسیم رہا ہے۔ ایک زمانہ "غیبتِ صغریٰ" اور ایک "غیبت کبریٰ" اسکی بھی خبر معصومینؑ کی زبان پر پہلے ہی آچکی تھی جیسے پیغمبر خداؐ کا ارشاد "اس کے لئے ایک غیبت ہو گی جس میں بہت سی جماعتیں گمراہ پھرتی رہیں گی" اور اسکی غیبت کے زمانہ میں اسکے اعتقاد پر برقرار رہنے والے "گوگرد سرخ" سے زیادہ نایاب ہوں گے۔ حضرت علی ابن ابی طالبؑ کا ارشاد ہے قائم آل محمدؐ کے لئے ایک طولانی غیبت ہو گی۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا ہے وہ منظر کہ دوستان اہلبیت اسکی غیبت کے زمانے میں سرگرداں پھر رہے ہیں جس طرح جانور چراگاہ کی تلاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔"

دوسری حدیث میں "اسکا ظہور ایک ایسی غیبت اور حیرانی کے بعد ہو گا

جس میں اپنے دین پر صرف با خلاص اصحاب یقین ہی قایم رہ سکیں گے۔" امام حسنؑ کا قول "اللہ اُسکی عمر کو اسکی غیبت کی حالت میں طولانی کرے گا۔" امام حسینؑ کا ارشاد "اُس کی ایک غیبت ہوگی جس سے بہت سی جماعتیں گمراہ ہو جائیں گی۔" امام محمد باقرؑ کا ارشاد "اس کی غیبت اتنی طولانی ہوگی کہ بہت سے گمراہ ہو جائیں گے امام جعفر صادقؑ نے فرمایا" مہدیؑ ساتویں امام کی اولاد میں سے پانچواں ہوگا اس کی ہستی تمہاری نظروں سے غائب رہیگی" دوسری حدیث میں "صاحب الامر کے لئے ایک غیبت ہونے والی ہے اس وقت ہر شخص کو لازم ہے کہ تقویٰ اختیار کرے اور اپنے دین پر مضبوطی سے قایم رہے۔" امام موسیٰ کاظمؑ فرماتے ہیں" اس کی صورت لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگی مگر اسکی یاد اہل ایماں کے دلوں سے غائب نہ ہوگی وہ ہمارے سلسلہ کا بارہواں ہوگا۔" امام رضاؑ "اس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار رہے گا۔" امام محمد تقیؑ "مہدی وہ ہے جس کی غیبت کے زمانہ میں اس کا انتظار اور ظہور کے وقت پر اس کی اطاعت لازم ہوگی۔" امام علی النقیؑ "صاحب الامر وہ ہوگا جس کے متعلق بہت سے لوگ کہتے ہوں گے وہ ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔" امام حسن عسکریؑ "میرے فرزند کی غیبت ایسی ہوگی کہ سوا ان لوگوں کے جنھیں اللہ محفوظ رکھے سب شک و شبہ میں مبتلا ہو جائیں گے۔" اسی کے ساتھ امام محمد باقرؑ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ "قائم آل محمد کے لئے دو غیبتیں ہیں ایک بہت طولانی اور ایک اس کی بہ نسبت مختصر۔" امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ "ایک دوسرے کی بہ نسبت بہت طولانی ہوگی۔" ان ہی

احادیث کے پہلے سے موجود ہونے کا نتیجہ تھا کہ امام حسن عسکریؑ کے بعد ان کے اصحاب اور مومنین مخلصین کسی شک و شبہ میں مبتلا نہیں ہوئے اور انھوں نے کسی حاضر الوقت مدعی امامت کو تسلیم کرنے کے بجائے اس امام غائبؑ کے تصور کے سامنے سر تصدیق خم کر دیئے۔

## غیبت صغریٰ

پہلی غیبت کا دور ۲۶۰ھ سے ۳۱۹ھ تک انھتر سال قائم رہا۔ اس میں سفرار خاص موجود تھے یعنی ایسے حضرات جن کو مخصوص طور پر نام کی تعیین کے ساتھ امام کی جانب سے نائب بنایا گیا تھا کہ شیعوں کے مسائل امام تک پہونچائیں ان کے جوابات حاصل کریں۔ اموال زکواۃ و خمس کو جمع کر کے انھیں مصارف خاصہ میں صرف کریں اور جو قابل اعتماد اشخاص ہوں اُن تک خود امام کی تحریرات کو بھی پہونچا دیں ورنہ خود حضرت سے دریافت کر کے اُن کے مسائل کا جواب دیدیں یہ حضرات علم و تقویٰ اور راز داری میں اپنے زمانے کے سب سے زیادہ ممتاز اشخاص تھے اس لئے اُن کو امامؑ کی جانب سے اس خدمت کا اہل سمجھا جاتا تھا۔ یہ حسب ذیل چار بزرگوار تھے۔

(۱) ابو عمرو عثمان بن سعید بن عمرو عمری اسدی یہ پہلے امام علی نقیؑ کے بھی سفیر رہے تھے۔ پھر امام حسن عسکریؑ کے زمانے میں بھی اس خدمت پہ مامور رہے اور پھر حضرت "امام منتظر" کی جانب سے بھی سب سے پہلے اسی عہدہ پر یہی قائم ہوئے چند سال اس خدمت کو انجام دے کر بغداد میں انتقال کیا وہیں دفن ہوئے

(۲) اُن کے فرزند ابو جعفر محمد بن عثمان بن سعید عمری امام حسن عسکریؑ نے

ان کے منصب سفارت پر برقرار ہونے کی خبر دی پھر اُن کے والد نے اپنی وفات کے وقت بحکم امام اُن کی نیابت کا اعلان کیا۔ جمادی الاوّل ۳۰۵ھ میں بغداد میں وفات پائی۔

(۳) ابو القاسم حسین بن روح بن ابی بحر نوبختی۔ علم و حکمت کلام و نجوم میں خاص امتیاز رکھتے ہوئے مشہور خاندان نوبختی کی یادگار اور خود بڑے جلیل المرتبت پرہیزگار عالم تھے۔

ابو جعفر محمد بن عثمان نے اپنی وفات کے بعد امام کے حکم سے اُن کو اپنا قایم مقام بنایا پندرہ برس عہدۂ سفارت انجام دینے کے بعد شعبان ۳۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی

(۴) ابو الحسن علی بن محمد سمری یہ آخری نائب تھے۔ حسین بن روح کے بعد بحکم امامؑ اُن کے قائم مقام ہوئے اور صرف نو برس اس فریضہ کو انجام دینے کے بعد ۱۵ شعبان ۳۲۹ھ میں بغداد میں انتقال کیا وقت آخر جب ان سے پوچھا گیا کہ آپ کے بعد نائب کون ہوگا تو انھوں نے کہہ دیا کہ اب اللہ کی مشیت ایک دوسری صورت کا ارادہ رکھتی ہے جس کی آخری مدت اُسی کو معلوم ہے۔

اب اس کے بعد کوئی نائب خاص باقی نہ رہا اسی ۳۲۹ھ کے اندوہناک سال میں کافی کے مصنف ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب کلینیؒ اور شیخ صدوقؒ کے والد بزرگوار علی بن بابویہ قمیؒ نے بھی انتقال فرمایا تھا اور ان حوادث کے ساتھ غیر معمولی طور پر یہ منظر دیکھنے میں آیا کہ آسمان پر ستارے اس کثرت سے ٹوٹ رہے ہیں کہ ایک محشر معلوم ہوتا ہے اس لئے اس سال کا نام رکھ دیا گیا "عام تناثر النجوم" یعنی تاروں کے انتشار کا بد سال اس کے بعد اندھیرا چھا گیا۔ سخت اندھیرا اس لئے کہ کوئی ایسا شخص سامنے نہ رہا جو امامؑ کی خدمت میں پہونچنے کا وسیلہ ہو۔

## غیبت کبریٰ

۳۲۹ھ کے بعد سے جو زمانہ ہے اُسے "غیبت کبریٰ" کہتے ہیں اس لئے کہ اب کوئی خاص نائب بھی باقی نہیں رہا ہے اس دور کے لئے خود حضرت "امام عصر" نے یہ ہدایت فرما دی تھی کہ "اس صورت میں دیکھنا جو لوگ ہمارے احادیث پر مطلع ہوں اور ہمارے حلال و حرام یعنی مسائل سے واقف ہوں ان کی طرف رجوع کرنا۔ یہ ہماری جانب سے تمہارے اوپر حجت ہیں۔"
اس حدیث کی بنا پر علمائے شیعہ اور مجتہدین کو "نائب امام" کہا جاتا ہے مگر یہ نیابت باعتبار صفات عمومی حیثیت سے ہے خصوصی طور پر باعتبار نام زدگی نہیں ہے یہی خاص فرق ہے ان میں اور اُن نائبین میں جو غیبت صغریٰ کے زمانہ میں اس منصب پر فائز تھے اس زمانۂ غیبت میں بھی یقیناً امام علیہ السلام ہدایت خلق اور حفاظت حق کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ہماری کسی نہ کسی صورت سے رہنمائی فرماتے ہیں خواہ وہ ہمارے سامنے نہ ہوں اور ہمیں محسوس و معلوم نہ ہو یہ پردہ اُس وقت تک رہے گا جب تک مصلحت الٰہی متقاضی ہو اور ایک وقت ایسا جلد آئیگا (خواہ وہ جلد ہمیں کتنی ہی دُور پر معلوم ہوتا ہو) کہ یہ پردہ ہٹے گا اور امام علیہ السلام ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے معمور فرمائیں گے اسی طرح جیسے وہ اس کے پہلے ظلم و جور سے بھری ہوئی ہو گی (اللھم عجل فرجہ وسھل مخرجہ)

# امامیہ مشن کے دو عظیم دینی خدمات

**تراجم قرآن پاک** کلام الٰہی کے حقائق و معارف کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ہم نے صرف ترجمہ حواشی کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے اس سلسلہ میں دو پاروں کے تراجم کی اشاعت ہو چکی ہے اور عنقریب تیسرے پارہ کا بھی ترجمہ شائع ہوگا اور اسطرح رفتہ رفتہ ہر پارہ کا ترجمہ شائع کر کے اس سلسلہ کو مکمل کر دینا مقصود ہے۔

**تاریخ اسلام** ہمارے بزرگوں کو زمانہ نے اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اسلام کی تاریخ کو حقائق کی روشنی میں دنیا کے سامنے پیش کر سکتے۔ انھوں نے اس تاریک دور میں "شیعی علم کلام" اور "فقہ جعفری" کو محفوظ کر کے جو کارنامہ انجام دیا وہی قیامت تک یادگار رہنے والا ہے۔

اب اس دینی مقصد کی طرف بھی آپ کے اس مشن نے توجہ کی اور بحمد اللہ تاریخ اسلام کا پہلا حصہ جو آنحضرتؐ کے ہجرت تک کے حالات پر مشتمل ہے شائع کیا جا چکا ہے جو بہت مقبول ہوا اور ہر طرف سے دوسرے حصص کی اشاعت کا مطالبہ ہو رہا ہے۔

ضرورت ہے کہ آپ اپنے مشن کو توسیع ممبری، خریداری کتب و رسائل اور عطایا کے ذریعہ اس قابل بنا دیں کہ وہ ان دونوں اہم دینی ضروریات کا بھی جلد از جلد تکملہ کر سکے۔

الداعی الی الخیر

سید ابن حسین نقوی آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ

---

پبلشر۔ مرزا حیدر حسین۔ اسسٹنٹ سکریٹری امامیہ مشن نخاس۔ لکھنؤ